اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

سلیم احمد: شخصیت اور فن

ڈاکٹر مختار احمد عزمی

پاکستانی ادب کے معمار

سلیم احمد
شخصیت اور فن

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل
عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

پاکستانی ادب کے معمار

سلیم احمد
شخصیت اور فن

E Books
WHATSAPP GROUP

ڈاکٹر مختار احمد عزمیؔ

اکادمی ادبیات پاکستان

کتاب کے جملہ حقوق بحق اکادمی ادبیات پاکستان محفوظ ہیں۔

نگرانِ اعلیٰ	:	فخر زمان
تدوین وطباعت	:	سعیدہ درانی
اشاعت	:	2009
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	کلاسیک، لاہور
قیمت	:	مجلد: -/225 روپے غیر مجلد: -/200 روپے

ISBN: 978-969-472-202-3

E Books
WHATSAPP GROUP

Pakistani Adab Ke Mamar

"Slim Ahmad: Shakhseyat-our-Fun"

Compiled By

Dr Mukhtar Ahmdad Azmi

Publisher

Pakistan Academy of Letters

Islamabad,Pakistan

فہرست

پیش نامہ

پاکستانی زبانوں میں ہمارے مشاہیر نے پاکستانی ادب کے حوالے سے جو کام کیا ہے کسی بھی بین الاقوامی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔اکادمی ادبیات پاکستان نے ان مشاہیر کے علمی وادبی کام اوراُن کی حیات کے بارے میں معلومات کوکتابی صورت میں لانے کے لیے پاکستانی ادب کے معمار کے نام سے اشاعتی منصوبہ شروع کیا ہے۔جس کے تحت پاکستانی زبانوں کے مشاہیر پر کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔

بیسویں صدی میں اردو شعر وتنقید میں جو معتبر نام ہمارے سامنے آئے ان میں ایک نام سلیم احمد ہے۔وہ ایک عمدہ شاعر اور ایک اہم نقاد تھے ان کی شاعری وتنقید دونوں ہی نہ صرف ان کے زمانے میں بلکہ آج بھی موضوع گفتگو بنتی رہتی ہے۔

اس اشاعتی منصوبے کی ایک کتاب ''سلیم احمد:شخصیت اورفن'' اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر معروف محقق ڈاکٹر مختار عزمی نے تالیف کی ہے۔اس کتاب سے یقیناً اہل ادب اور عام قاری، سلیم احمد کی شخصیت اورفن سے بہتر طور پر آگاہ ہوسکیں گے۔

یہ کتاب سلیم احمد کے بارے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت کی حامل ہے۔امید ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے ''پاکستانی ادب کے معمار'' سلسلے کی کتاب ''سلیم احمد:شخصیت اورفن'' کوملک اور بیرون ملک یقیناً پسند کیا جائے گا۔

فخر زمان

E Books WHATSAPP GROUP

پیش لفظ

وادی تحقیق میں

پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ لکھنا ضروری ہوتا ہے، سو لکھ دیا ہے لیکن حق تو یہ ہے کہ حق شاید ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس جوکھم میں، جسے تحقیق کہتے ہیں، عمر عزیز ساری نہیں تو آدھی پونی ضرور کھپانی پڑتی ہے تب کہیں مصرعۂ تر کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس پُر خار وادی سے جو گزرے سو جانے۔

یہ مقالہ تکمیل کے بعد پندرہ برس تک میری بک شیلف کی زینت بنا رہا۔ حالات کی بخیہ گری نے اجازت ہی نہ دی کہ جامۂ صد چاک سی لیتے۔ بھلا ہو اکادمی ادبیات کے سابق چیئرمین جناب افتخار عارف کا جنہوں نے ''سلیم بھائی'' سے کمالِ محبت کا ثبوت دیا اور مقالہ کی اشاعت میں میری سرپرستی فرمائی۔ جناب فخر زمان، اکادمی ادبیات کے نئے چیئرمین کی وسعتِ فکر و نظر نے بھی میری رہبری کی۔

استادِ محترم ڈاکٹر شفیق احمد اور ڈاکٹر انور احمد اور ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر کے احسان سے میری گردن خم رہے گی۔ راہِ حیات میں دھوپ چھاؤں کی ساتھی پروین اختر، جانِ بابا ڈاکٹر تحریم مختار اور عزیز بیٹے حافظ احمد عمیر عزمی نے مجھے سوچنے، لکھنے اور کچھ کر گزرنے کے لئے آسانیاں فراہم کی ہیں۔ تمام احباب اور شاگردوں کا بھی خصوصی شکریہ۔

ڈاکٹر مختار احمد عزمی

سلیم احمد ، سوانح اور شخصیت

سلیم احمد نے " کھیولی " نامی گاؤں میں جنم لیا۔ یہ گاؤں بھارت کے ضلع بارہ بنکی (یو پی) میں واقع ہے۔ قریب ہی مشہور قصبہ دیوہ شریف[1] ہے۔ سلیم احمد نے اپنی طویل نظم "مشرق" میں " کھیولی " کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ " مگر میں جو اِک نام ہوں، ایک پہچان ہوں، چوالیس برس پہلے یو پی کے اِک گاؤں " کھیولی " میں پیدا ہوا۔ "[2]

خاندان اور شجرۂ نسب

سلیم احمد کا خاندان "ساداتِ علویہ" کہلاتا ہے کیونکہ اُن کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مِلتا ہے۔ سلیم احمد کے چھوٹے بھائی پروفیسر شمیم احمد لکھتے ہیں۔ "بارہ بنکی ہمارا وطن ہے۔ ہم کھیولی کے رہنے والے ہیں ہم جو علیؑ کی اولاد ہیں، عرب اور ترکستان کی کتنی ہی منزلیں طے کر کے ہندوستان آئے۔ ہم سالار مسعود غازی کے اہل خاندان ہیں۔"[3]

سالار مسعود غازی کے والد سالار محمود ساہو غازی، نامور سلطان محمود غزنوی کی افواج کے سالارؒ اور سلطان کے بہنوئی تھے۔ سالار مسعود غازی مشرقی یو پی کے فاتح تھے۔ وہ "غازی میاں" کے نام سے اودھ کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ انہوں نے ۱۰۶۰ء میں اودھ پر حملہ کیا تھا۔ اس حملے میں وہ نیپال کی ترائی میں واقع بہرائچ تک جا پہنچے۔ سرکاری دستاویز بھی محولہ بالا بیانات کی تصدیق کرتی ہیں۔

" THE MOHAMMADAN'S CONQUEST WAS EFFECTED EARLIER AND MORE THOROUGHLY THAN IN MOST PARTS OF OUDH.SYED SALAR, THE HERO OF MANY POPULAR BALLADS, IS SAID TO HAVE FIXED HIS HEAD- QUARTERS FOR A TIME AT

ASSIGN THE SATRITKH AND SEVERAL MOSLAMAN FAMILIES SETTLEMENT OF THEIR ANCESTORS TO THIS PERIOD."

سالار (محمود غازی) نے "ستر کھ" کو اپنا مستقر بنالیا تھا۔ یہیں اُن کے بعض اخلاف قیام پذیر ہو گئے تھے۔ آگے چل کر "ستر کھ" ہی سے "ساداتِ علویہ" کے جدِّ امجد شاہ نعمت اللہ شہید نے کھول گڑھ اور دیول گڑھ پر حملہ کیا اور انہیں فتح کیا۔

یہاں سلیم احمد کا خاندانی شجرہ۵ درج کرنا مناسب ہوگا۔

شجرہ

سالار محمود ساہو غازی، شاہ عطاء اللہ غازی، سید محمد طاہر غازی، شاہ حیات اللہ، شاہ نجابت اللہ، سیّد رفعت اللہ، سیّد کلیم اللہ، سیّد وحید اللہ، سیّد امین، سیّد فرحت اللہ، شاہ نعمت اللہ شہید فاتح کھیول گڑھ، سید امانت اللہ، خواجہ سیّد اللہ داد، سید نعمت اللہ، سید رحمت اللہ عرف باراتی میاں، سیّد محمد ماہ، سیّد محمد اشرف، سیّد معین الدین اشرف عرف خواجہ نظر دل، بی بی مستقیم النساء، بی بی خیر النساء، سیّد مدد علی، سیّد پیر علی، سیّد مراد علی، سیّد نجابت علی، سیّد حسین علی، سیّد عباس علی ہنر، سیّد سخاوت علی، سیّد شجاعت علی شجاع، سیّد لیاقت علی، سیّد لطافت علی، سیّد رفاقت علی ہجر، سیّدہ شمس النساء، سیّد شرافت علی، (سیّد) سلیم احمد، (سیّد) شمیم احمد، سیّدہ زاہدہ عُزیر۔

خاندانی پس منظر

سلیم احمد نے اپنی شعری تصنیف "مشرق" میں اپنے خاندانی پس منظر کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "اودھ کے ضلع بارہ بنکی میں چھوٹا سا اک گاؤں کھیولی ہے، جو ڈھائی سو سال سے مرے آباء کا مسکن ہے، نظر دل جو دادا کے دادا تھے، اس گاؤں میں آئے تھے۔"٦

یہ زمانہ (خواجہ نظر دل کا زمانہ) غالباً وہ رہا ہوگا جب صوفیاء کا اثر پورے برصغیر میں بہت نمایاں تھا۔ غالباً سب "رس" مصنف ملا وجہی کے علامتی قصے میں دل اور نظر کی علامتیں اسی تعلق سے ملتی ہیں۔

خواجہ صاحب کا مزار جو کہ کھیولی میں موجود ہے اب بھی اُن کی عظمت کی گواہی دیتا ہے۔
شمیم احمد کا بیان ہے۔ "شجرے کے مطابق سیّد عباس علی ہنرؔ کا سلسلۂ نسب بائیسویں پشت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے۔" ۷

خاندانی نجابت کا امین یہ شجرۂ نسب ظاہر کرتا ہے کہ سلیم احمد کا خاندان واقعی عربستان سے اکنافِ ہند تک پہنچا لیکن کن ذرائع سے؟ یہ بات معلوم نہیں ہو سکی۔ دورِ حاضر کی بے چہرگی میں اس قدر شجرۂ نسب بھی غنیمت ہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں خاندانی خدمات

ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح اودھ کے علاقے خصوصاً بارہ بنکی میں بھی انگریزوں کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جہاں ہندوستان بھر کے مجاہدینِ آزادی نے دادِ شجاعت دی، وہاں ضلع بارہ بنکی کے جیالوں نے بھی بے مثال قربانیاں پیش کیں۔ اِن میں کھیولی اور گردونواح کے بہادروں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ انگریزوں کی فتح کے بعد یہ جیالے بہت عرصے تک جنگلوں اور پہاڑوں (نیپال کی ترائی وغیرہ) میں روپوش رہے اور گوریلا جنگ لڑتے رہے۔ بقول شمیم احمد "انگریزوں نے بارہ بنکی کو شورش زدہ علاقہ قرار دے رکھا تھا روایت ہے کہ ۱۹۲۵ء تک انگریز انتظامیہ یہاں بالکل غیر مؤثر رہی تھی۔" ۸

سلیم احمد کے خاندان نے بھی جنگِ آزادی میں بھرپور حصّہ لیا۔ خاص طور سے اِن کے پردادا مددعلی اور اُن کے بھائیوں نے بہت سے نمایاں کارنامے دیئے۔ شمیم احمد کا بیان ہے۔
"سیّد حسین علی بیلے گارد کے مقابلے میں حضرت محل کے لشکر میں شامل تھے اور گولہ لگنے سے شہادت پائی تھی۔ انگریزوں نے مددعلی کو گرفتار کر لیا اور طرح طرح کے مظالم کا شکار بنایا حتیٰ کہ مکان کی چھت کی کڑیوں میں اُن کے چاروں ہاتھوں پیروں میں بڑی بڑی میخیں ٹھونک دی تھیں۔" ۹

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی فتح کے بعد یہ لڑائیاں اور نفرتیں آپس کی سرپھٹول میں بدل کر منفی رنگ اختیار کرنے لگیں۔ ۱۹۲۵ء تک انگریزوں کی انتظامیہ ان معنوں میں غیر مؤثر نہیں تھی کہ وہ

مجاہدین آزادی پر قابو نہ پا سکی بلکہ لڑائی جھگڑے اور باہمی شورشوں کے حوالے سے غیر مئوثر ہونا ہے۔ ضلع بارہ بنکی کے بارے میں یہ تاثر پیدا ہو چکا تھا۔

"THE DISTRICT INDEED BARE AN EVIL REPUTATION FOR TURBULANCE AND DISORDER.THE DISTRICT JAIL HAD A DAILY PRISIONERS IN 1903 AVERAGE OF 425

یہ تھا وہ اجتماعی سیاسی وسماجی ماحول جس میں سلیم احمد نے سیّد شرافت علی کے گھر میں آنکھ کھولی۔

دودھیال اور ننھیال

سیّد عباس علی ہنؔر کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان میں سلیم احمد کے والد سید شرافت علی سب سے چھوٹے تھے۔ سیّد ہنؔر کی اولاد لکھنؤ میں زندگی کے مختلف شعبوں میں مصروف کار تھی۔ ان کے دو بیٹے سید سخاوت علی اور سید شجاعت علی لکھنو کے اچھے اطبا میں سے تھے۔ سیّد لطافت علی عدالت میں امین معاوضہ تھے۔ سیّد لیاقت علی کو ابتداء ہی سے دینی تعلیم کا شوق تھا۔ عربی مدارس سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مُرید ہو گئے تھے۔ سیّد رفاقت علی سکول ٹیچر تھے۔ ان کے بعد ایک بیٹی شمس النساء تھی۔

سیّد شرافت علی ایک چھوٹی سی جاگیر "سالے نگر" میں ضلعدار تھے۔ ان کو اپنے گاؤں کھیولی سے بہت محبت تھی ایک وقت ایسا آیا کہ انہوں نے لکھنو سے اپنی سکونت ترک کر کے، جہاں اُن کا خاندان کھیولی سے منتقل ہو گیا تھا، دوبارہ کھیولی میں رہائش کا فیصلہ کر لیا۔ اُن کے بڑے بھائی سیّد لیاقت علی کا بھی یہی ارادہ تھا کہ کھیولی میں اپنی آبائی زمین پر کام کیا جائے۔ یہاں آبائی مکان مسمار ہو چکا تھا۔ سیّد شرافت علی نے یہاں ایک پختہ مکان بنوایا۔ زمینداری کے ساتھ ساتھ وہ کپڑے کی تجارت بھی کرنے لگے۔

سلیم احمد کے نانا حکیم حامد حسن صدیقی کیرانہ ضلع مظفر نگر (انڈیا) کے رہنے والے تھے۔ پَر نانا حکیم احمد حسن صدیقی کیرانہ کے مشہور طبیب تھے۔ اِن کے چھوٹے بیٹے سعید حسن صدیقی لکھنو پولیس میں اعلیٰ عہدیدار تھے۔ حامد حسن صدیقی کی بڑی بیٹی کا نام کبریٰ اور چھوٹی کا نام صغریٰ تھا۔

یہی صغریٰ سلیم احمد کی والدہ تھیں۔ ایک تیسری بہن حُسنہ بھی تھیں۔

پنجاب اور یوپی کی روایت ہے کہ بیٹیوں پر بیٹوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کبریٰ کے بعد جب صغریٰ پیدا ہوئیں تو کسی رشتہ دار نے کہہ دیا "بس بھئی غنیمت ہے۔" اس طرح صغریٰ کا دوسرا نام "غنیمت" پڑ گیا۔ بچپن میں کافی صحت مند تھیں اور دَھم دَھم کر کے چلتی تھیں۔ لہٰذا بزرگ انہیں "دَھمو" بھی کہتے تھے۔ بعد میں اِن کے بچے انہیں امّی یا والدہ کی بجائے "آپا" کہہ کر بُلاتے تھے۔ بڑی بہن یعنی کُبریٰ کو سب بچے امّی کہتے تھے۔ سیّد شرافت علی کی شادی اپنے خاندان سے باہر ہوئی تھی۔ شادی کے بعد نو بیاہتا جوڑا آبائی گاؤں کھیولی میں آ کر رہنے لگا۔ سیّد شرافت علی نے یہاں پختہ مکان بنوانے کے علاوہ ایک خوبصورت باغ بھی لگوایا جہاں دُور دُور سے لا کر قلمی آموں کے پودے لگوائے۔ یہیں سلیم احمد کی ولادت ہوئی۔

سلیم احمد کی پیدائش

سلیم احمد کی تاریخِ پیدائش ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ وہ اپنی زندگی میں مختلف تاریخ ہائے پیدائش استعمال کرتے رہے۔ اُن کے میٹرک کے سرٹیفکیٹ پر "یکم دسمبر ۱۹۲۷ء" کی تاریخ و سنہ درج ہے۔[۱۱] یہی تاریخ اُن کے مختلف انٹرویوز میں سوانحی خاکے کی ذیل میں درج ہے۔ لیکن سلیم احمد کی زندگی ہی میں مرتب ہونے والے اُن کے مجموعہ کلام "اکائی" کے فلیپ پر "نومبر ۱۹۲۷ء" کا حوالہ بھی ملتا ہے یعنی تاریخ درج نہیں مگر مہینہ اور سنہ موجود ہے۔ آخری مجموعہ کلام "مشرق" میں سلیم احمد نے لکھا ہے۔ "۱۵ مئی ۱۹۳۶ء کو میرے والد سیّد شرافت علی کا انتقال ہوا۔ اُس وقت میری عمر ۹ سال تھی۔"[۱۲]

گویا اس حساب سے سلیم احمد کا سالِ پیدائش ۱۹۲۷ء بنتا ہے تاہم تاریخ اور مہینے کا صحیح تعین ابھی باقی ہے! سلیم احمد اپنی تاریخ پیدائش کے حوالے سے اپنے بعض دوستوں سے بھی تبادلہء خیال کرتے رہتے تھے۔ اُن کے دوست سراج منیر کا کہنا ہے۔ "سلیم بھائی کی تاریخ پیدائش ۲۵ مارچ ۱۹۲۷ء ہے۔ یہ تاریخ خود سلیم بھائی نے مجھے بتائی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ اُس تاریخ کو جمعہ کا

دن اور ساڑھے چار بجے صبح کا وقت تھا۔"[۱۳]

اس تمام بحث کے حوالے سے شمیم احمد کا بیان کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔ انہوں نے آپا (والدہ مرحومہ) کے حوالے سے کہا۔ "آپا کہا کرتی تھیں کہ جب سلیم پیدا ہُوا تو رمضان المبارک کا مہینہ اور جمعہ کا دن تھا۔ یہ رمضان کا پہلا جمعہ تھا سنہ ء شاید ۱۹۲۷ء تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ اس موقع پر ایک طویل عرصہ کے بعد تمہارے (شمیم احمد کے) تمام تائے کھیولی میں جمع ہوئے تھے"[۱۴]

دیگر تمام بیانات کے مقابلے میں والدہ کا بیان زیادہ قابل توجہ ہے۔ اس بیان کی روشنی میں تین باتیں زیادہ اہم ہیں یعنی جمعہ کا دن، نیز یہ رمضان المبارک کا پہلا جمعہ تھا، سردیوں کا موسم اور سنہ ء "شاید" ۱۹۲۷ء۔

۱۹۲۷ء کے حوالے سے دیکھا جائے تو رمضان المبارک ۱۳۴۵ھ کا پہلا جمعہ 11 مارچ یعنی ۷ رمضان المبارک کو پڑتا ہے۔ اس میں باقی حوالے تو درست نہیں لیکن مارچ کا مہینا سردیوں کا موسم نہیں ہوتا۔ اگر ۱۹۲۸ء یعنی ایک سال بعد کا حساب لگایا جائے تو درج ذیل سنہ ء تاریخ کے حوالے سے سلیم احمد کی تاریخ پیدائش زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔ "۲۴ فروری ۱۹۲۸ء جمعتہ المبارک بمطابق ۳ رمضان المبارک ۱۳۴۶ھ"

مذکورہ بالا تاریخ کو دیکھا جائے تو تاریخ، دن اور موسم تو والدہ (آپا) کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں لیکن سنہ ء ۱۹۲۷ء کی بجائے ۱۹۲۸ء نکلتا ہے چونکہ والدہ کے بیان میں "شاید" کا امکان موجود ہے۔ اس لئے تقویمی حقائق کی روشنی میں ۱۹۲۸ء ہی زیادہ قرین حقیقت لگتا ہے۔ شمیم احمد نے ایک اور جگہ بھی تاریخ وسنہ ء ولادت کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپا نے فرمایا۔ "سلیم ۳ رمضان ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے"[۱۵]

۳ رمضان کو پہلا جمعتہ المبارک ۱۹۲۸ء میں پڑتا ہے نہ کہ ۱۹۲۷ء میں۔ سلیم کا وقت پیدائش ساڑھے چار بجے صبح بتایا جاتا ہے۔ اس موقع پر سلیم احمد کے تمام تائے کھیولی میں ایک طویل عرصے کے بعد جمع ہوئے تھے۔ کافی عرصہ پیشتر وہ تمام تلاش کے سلسلہ میں کھیولی چھوڑ چکے تھے۔ سلیم احمد کو دیکھتے تو سب لوگ یہی تبصرہ کرتے۔ "شرافت تمہارے بیٹے کا سر نظر دل (دادا کے دادا) پر گیا ہے۔ سر بڑا

Hasnain Sialvi

سردارکہ، پاؤں بڑا گنوار کا (سلیم احمد کا سر بڑا تھا)"[٦]

ابتدائی ماحول

سلیم احمد کی پیدائش کے وقت سیّد شرافت علی اور لیاقت علی کھیولی ہی میں مقیم تھے۔ آخر الذکر صوفی منش انسان تھے۔ اُن کے اولادِ نرینہ نہ تھی، صرف تین لڑکیاں تھیں۔ اس لحاظ سلیم احمد کو بچپن میں ہر جگہ کافی لاڈ پیار ملا۔ سلیم احمد کے یُوں تو کئی بھائی بہن ہوئے لیکن صرف تین زندہ بچے، خود سلیم احمد، شمیم احمد اور زاہدہ، سلیم احمد کی پیدائش کے تقریباً چھ سال بعد شمیم احمد (۱۹۳۳ء) اور اُن کے ڈھائی سال بعد (۱۹۳۶ء) زاہدہ پیدا ہوئیں۔

والد کا مزاج

سید شرافت علی کچھ شوخ مزاج اور جذباتی تھے۔ جلد غصّے میں آجاتے اور جلد ہی یہ غصّہ فرو بھی ہو جاتا۔ جب زمینداری کے معاملے یا کسی گھریلو مسئلے میں کوئی ملازم گڑبڑ کرتا تو اُسے بے طرح مارتے تھے لیکن مزاج میں کوئی ایسی چیز تھی کہ پھر اپنے ہاتھ سے دوادارو اور ہلدی چونا بھی کرتے۔ گھر میں آکر پچھتاتے اور روتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے حریفوں کے ساتھ اچانک کوئی غیر متوقع بات کر جاتے۔ ایک بار، انہوں نے اپنے ایک قدیمی حریف زمیندار کی نہ صرف ضمانت کرائی بلکہ اس مقصد کے لئے پولیس کو رشوت بھی دی۔ اپنے والد کے مزاج کے بارے میں سلیم احمد نے لکھا ہے۔

یہ نرمی جو تھی اُن کے کردار کی تھی وہ سختی جو تھی اک زمیندار کی تھی
انہیں دل مِلا تھا تضادات کا گھر کہ تھا موم کا موم اور پتھر کا پتھر

بیگم شرافت نے اِس ماحول کو بدلنے کے لئے اپنی کوششیں شروع کر دیں۔ انہوں نے نہایت حکمت اور سلیقے سے شرافت علی کے روٹھے ہوئے عزیزوں کو منانے اور قربتیں بڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بیگم شرافت علی کی اس جراءت سے برسوں کے زنگ آلود قفل کھلنے لگے۔

شرافت علی خلیق اور بامرّوت تھے مگر شوخی اور جذباتی پن طبیعت میں زیادہ تھا۔ اپنی بیوی کا

بہت خیال رکھتے تھے۔ کھیولی سے انہیں بے حد پیار تھا۔ اکثر اس علاقے سے منسوب دوہے اور گیت گاتے۔ اُن کے گھر کے پاس ہی ایک بہت خوبصورت منظر کا حامل، تالاب تھا۔ اکثر اس تالاب اور کھیولی کے حوالے سے گیت گاتے۔

والد کی ناگہانی وفات

ایک بار سیّد لیاقت علی بس کے حادثے میں شدید زخمی ہو گئے۔ اتفاقاً سیّد شرافت علی اور اُن کے بڑے بھائی حکیم سیّد شجاعت علی بھی جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ انہوں نے زخمی بھائی کو فوراً ہسپتال پہنچایا مگر وہ جانبر نہ ہو سکے۔ سیّد شرافت علی کے دل، دماغ پر اپنے ایک متقی اور مونس وغمخوار بھائی کی ناگہانی موت کا گہرا اثر ہوا۔ اس واقعے نے اُن کا دل دُنیا سے پھیر دیا۔ سب مسکراہٹیں بھول گئے اور اکثر عبادات میں مصروف رہنے لگے۔ بس والے پر مقدمہ دائر کر دیا گیا تھا۔ ایک بار پیشی سے واپس آئے تو بیمار پڑ گئے۔ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں گئے۔ واپس آئے تو بخار تیز ہو چکا تھا۔ دوسرے روز زبان بند ہو گئی۔ اگلے روز ذرا سی دیر کے لئے ہوش میں آئے، آنکھ کھولی اور زبان سے کچھ کہا۔ شاید اللہ، اللہ کہا۔ اسی روز اتالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اُن کا انتقال ۱۵ مئی ۱۹۳۶ء کو ہوا۔ والد کی وفات کے وقت سلیم احمد کی عمر (۸) آٹھ سال سے کچھ زیادہ تھی۔

والد کے حوالے سے جہاں سلیم احمد کے دل میں بچپن کی نرم اور کومل یادیں محفوظ رہیں وہاں ایک آدھ تلخ یاد بھی عمر بھر اُن کے حافظے میں محفوظ رہی۔ ایسی ہی ایک یاد اس باغ سے بھی وابستہ ہے۔ جو سیّد شرافت نے نیا نیا لگوایا تھا۔ جب اس باغ میں لگائے گئے آموں کے نہایت قیمتی بوٹوں پر پہلی بار بُور آیا تو شرافت علی کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ سلیم احمد ابھی بچے تھے۔ وہ شام کو اپنے دوستوں کے ہمراہ باغ کی سیر کے لئے گئے۔ نجانے ان کے جی میں کیا آئی کہ تمام آموں کو جھوڑ ڈالا۔ شرافت علی کو اپنے باغ کا یہ حشر دیکھ کر سخت غصہ آیا۔ انہوں نے سلیم احمد کے ایسا زور دار طمانچہ مارا کہ گال پر انگلیوں کے نشانات بن گئے۔

بہر حال سیّد شرافت علی کی جواں مرگی سے یہ گھرانہ نئی مسائل میں الجھ گیا۔ اُن کی زندگی میں

بچوں کو بھی آسائشیں میسر تھیں۔ نیا پختہ مکان کافی کشادہ تھا، زمینداری تھی، آموں کا نیا باغ تھا، کپڑے کی تجارت تھی، میاں، بیوی، دو بیٹے اور ایک بیٹی گویا اس خاندان کی اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ شرافت علی کی وفات سے گھر کا سارا بوجھ آپا پر آن پڑا۔ یتیم بچے ابھی چھوٹے تھے اور کمانے کے قابل نہ تھے۔ اس تلخ صورت حال کو سلیم احمد نے یوں بیان کیا ہے۔

وہ اک دشتِ بے آب یعنی جوانی
مری ماں کی وہ بیوگی کی کہانی
وہ بارِ غم و رنج اللہ اکبر
پہاڑوں کے دل جس سے پھٹ جائیں یکسر

ابتدائی تعلیم ۔ کھیولی میں

والد کی زندگی میں شفقتِ پدری کی ٹھنڈی چھاؤں تلے سلیم احمد کی ابتدائی تعلیم کا آغاز کھیولی ہی میں ہو چکا تھا۔ یہاں اگرچہ ایک پرائمری سکول موجود تھا لیکن یہ کوئی معیاری تعلیمی ادارہ نہ تھا۔ پہلی دوسری جماعت تک سلیم احمد کھیولی ہی میں پڑھتے رہے۔ بعد ازاں بہتر تعلیم کے لئے دو ڈھائی کوس کے فاصلے پر واقع متئی کے پرائمری سکول میں جانے لگے۔ یہاں بھی اطمینان خاطر نصیب نہ ہوا تو چند کوس کے فاصلے پر واقع گرسی کے مڈل سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ کھیولی، متئی اور گرسی میں ابتدائی تعلیم کا یہ زمانہ ۳۴-۱۹۳۲ء پر محیط ہے۔

لکھنؤ میں تعلیم

اپنے والد کی وفات سے پہلے سلیم احمد تایا سیّد لطافت علی کے ہمراہ لکھنؤ آئے تو انہیں سب سے پہلے "چرچ مشن ہائی سکول لال باغ لکھنؤ" میں داخل کرایا گیا۔ سلیم احمد کا بیان ہے۔
"غالباً اس سکول میں قراۃ العین حیدر بھی میرے ساتھ ہی ہوں گی کیونکہ انہوں نے بھی ابتدائی تعلیم اسی سکول سے پائی تھی۔"[۷] یہاں سلیم احمد نے متی کی انجیل کی پوری تلخیص یاد کر لی تھی۔

اسکول میں کھیلے جانے والے ایک ڈرامے "سلومی" میں انہوں نے ایک کردار ادا کیا تھا۔

سیّد لطافت علی کو اُن کے عہدے کی وجہ سے سینما والے مفت پاس مہیا کرتے رہتے تھے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلیم احمد، بابو بھائی، زبیر اور عزیز نے بہت سی فلمیں دیکھیں۔ ان میں بمبئے کی بلی، طوفان میل، جلتی نشانی اور دیگر کئی فلمیں قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ لکھنؤ میں عورتیں پینوراما بھی دکھاتی تھیں۔ ان میں بارہ من کی دھوبن اور جھانسی کی رانی کے تماشے دیکھے۔

یہاں ایک بار سلیم احمد کو ایک کتے نے کاٹ لیا اور اُن کے چودہ انجکشن لگے۔ علاج کے دوران اُن کی اور بھی ناز برداریاں ہونے لگیں۔ کبھی چڑیا گھر اور کبھی عجائب گھر کی سیر ہوتی۔ انہی دنوں میں لکھنؤ میں وائسرائے کی آمد (۱۹۳۵ء) ہوئی۔ اس موقع پر منعقد ہونے والی خصوصی تقریبات کو بھی سلیم احمد نے اپنے عزیزوں کے ہمراہ دیکھا۔

سیّد لطافت علی کی محفل میں ہر مکتبہء فکر کے لوگوں کا آنا جانا تھا۔ پادری، پنڈت اور علماء بھی لطافت علی کے دوست تھے۔ سلیم احمد کی عمر اُس وقت اگرچہ کم تھی لیکن طبعی رجحان کی بناء پر ایسی محفلوں میں ہونے والی بات چیت کو نہایت توجہ سے سنتے۔ یہیں سے اُن میں تقابلِ ادیان کا شوق پروان چڑھا۔

سیّد شرافت علی کی وفات کے موقع پر لکھنؤ سے حکیم شجاعت علی بھی آئے۔ جب بیگم شرافت علی ایامِ عدت گزارنے کے لئے اپنی بہن کے ہاں "باندے" کو سدھاریں تو حکیم صاحب سلیم احمد کو تعلیم دلانے کے لئے لکھنؤ لے آئے۔ یہاں اُن کا داخلہ "شکلا ہائی اسکول" میں کرایا گیا۔

حکیم شجاعت علی پکے مسلم لیگی تھے۔ چوہدری خلیق الزماں، صدر آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھ اُن کے گہرے تعلقات تھے۔ وہ زمانہ لکھنؤ ہی میں نہیں بلکہ سارے برِصغیر میں سیاسی ہلچل کا زمانہ تھا۔ حکیم صاحب کے مطب پر آنے والے لوگ دن رات کانگریس، مسلم لیگ، مجلسِ احرار، خاکسار تحریک اور نجانے کن کن موضوعات پر بحث مباحثے کرتے رہتے۔ دنیائے اسلام میں ہونے والی تبدیلیوں پر بھی یہاں گفتگو ہوتی۔ سلیم احمد یہ سب باتیں گہری دلچسپی کے ساتھ سُنتے۔ سلیم احمد کا بیان ہے

" اس طرح سیاست اور مذہب بچپن ہی سے میری توجہ کا مرکز بن گئے "۱۸

انہوں نے خاکسار تحریک کا ترجمان اخبار "الاصلاح" بھی پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ خاکساروں کے جلوس اور مصنوعی جنگ بھی دیکھی۔ حکیم تایا سے واقدی کی "فتوح الشام" بھی سُنی۔ خاکساروں کے جلوہ دیکھ کر انہیں یُوں محسوس ہوتا گویا اسلامی عساکر پھر سے میدانِ جنگ میں جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

اسے حالات کی ستم ظریفی سمجھئے یا تقدیر کی گردش کہ اپنی تعلیم کی خاطر سلیم احمد شٹل کاک بنے رہے۔ کبھی کھیولی، کبھی لکھنؤ، پھر کھیولی، پھر لکھنؤ۔ وہ تیسری بار کھیولی آئے تو گرسی کے مڈل سکول کی آٹھویں جماعت سے سلسلہ تعلیم کو پھر سے جوڑا۔ اس دربدری نے سلیم احمد کی تعلیمی زندگی کے تین قیمتی سال ضائع کر دیئے۔ جب وہ بیگم حکیم شجاعت علی کے رویے سے بددل ہو کر تیسری بار (۱۹۳۹ء) کھیولی آئے تو یہاں آٹھویں جماعت میں داخل ہوئے۔ اسی سال انہوں نے گرسی کے مڈل سکول سے مڈل کا امتحان پاس کر لیا۔ اس وقت اُن کی عمر (۱۲) بارہ سال تھی۔

مطالعے کا شوق

سلیم احمد کی کتابوں سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ انہیں کھانے پینے کا ہوش بھی نہ رہتا۔ ایک بار دوپہر کے کھانے پر سلیم احمد نظر نہ آئے تو سب اہلِ خانہ کو تشویش ہوئی۔ بالآخر وہ بڑے صندوق میں پائے گئے جہاں وہ پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے۔

"میں اکثر رات گئے تک بھائی صاحب کو پڑھتے دیکھتا، وہ لالٹین جلائے نجانے کیا کیا پڑھتے رہتے۔ بڑی بڑی موٹی موٹی کتابیں۔ دوپہر سے سہ پہر تک اور پھر رات کو اُن کا مشغلہ کتابیں ہی پڑھنا تھا"۱۹

اُن کی کتابوں اور مطالعے سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ اس میں خلل اندازی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس حوالے سے ایک دفعہ جب شمیم احمد نے انہیں بار بار تنگ کیا تو انہوں نے آپا سے شکایت کر دی۔ جب پھر بھی شمیم احمد باز نہ آئے تو سلیم احمد نے ایک موٹی سی کتاب انہیں دے

ماری۔ منخنی سے شمیم احمد چکرا کر گر پڑے۔

اس دور میں اُن کی ایک اور خوبی نمایاں ہونے لگی یعنی غیر معمولی یادداشت ۔ سلیم احمد کی ذہانت کا اعتراف نہ صرف اُن کے اساتذہ کرنے لگے بلکہ عام لوگوں کو بھی اس ذہانت کا مظاہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ سلیم احمد کی ذہانت اور یادداشت کی تیزی نہ صرف بچپن بلکہ جوانی اور عمر کے آخری حصے تک برابر قائم رہی۔

لڑکپن کا یک تقاضا کھیل کود بھی ہے۔ سلیم احمد اس طرف بھی کچھ مائل تھے لیکن وہ زیادہ تر عسکری نوعیت کے کھیل کھیلتے مثلاً تیر اکی اور فن سپہ گری وغیرہ۔ شمیم احمد کہتے ہیں۔ " کبھی اپنے باغ سے کیلے کا تنا لا کر تیر کمان سے اس کا نشانہ لیتے اور کوشش یہ کرتے کہ تیر تنے کو چیر کر دوسری طرف نکل جائے۔ کبھی اپنے بازو اکڑا اکڑا کر اور اس کی مچھلی نکال کر مجھے دکھاتے۔ ابو جان کی تلوار نکال کر خود لے لیتے اور ڈھال مجھے دے دیتے اور تلوار زنی کی مشق کرتے "۲۰

آپا کی تربیت سے سلیم احمد میں صبر و استقامت، سنگینی حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم، نرم دلی اور مہمان نوازی جیسی صفات پیدا ہو چکی تھیں ۔ دوسری جنگ عظیم میں نازی فوج کا کوئی بھٹکا ہوا سپاہی کھیولی کی طرف آنکلا۔ سلیم اسے اپنے ہمراہ گھر لے آئے۔ دو تین دن تک گھر میں رکھا۔ خاطر مدارات کی اور علاج کیا۔ وہ سپاہی سلیم احمد کے حسنِ سلوک سے بہت متاثر ہوا۔ عزیزوں کے اصرار پر سلیم احمد نے بادلِ نخواستہ جانے کی اجازت دے دی اور جاتے ہوئے اُسے اپنی سکول کی فیس بھی دے دی۔

لڑکپن میں چھوٹے بڑے سب سلیم احمد کی انصاف اور امن پسندی کے قائل تھے۔ جب دشمنوں یا دوستوں میں کسی بات پر ٹھن جاتی تو ثالث سلیم احمد ہی کو بنایا جاتا۔ خود اُن کا کسی سے جھگڑا نہ ہوتا۔ سلیم احمد سچ بولتے اور سچ بولنے والے کی تائید کرتے۔

شعر و ادب کا شوق

بارہ تیرہ برس کی عمر میں سلیم احمد کی شعر گوئی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں شمیم احمد کا ایک

بیان دلچسپ ہے۔ "ایک رات جو میری آنکھ کھلی تو بھائی صاحب بستر سے غائب تھے۔ دیکھا کہ صحن میں ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف ٹہل رہے ہیں۔ صبح کو جب میں نے ٹہلنے کا سبب پوچھا تو ہنسنے لگے اور بولے کہ میں شعر کہہ رہا تھا"۲۱

سلیم احمد جلد ہی رواں ہو گئے اور اپنے پاس باقاعدہ ایک چھوٹی سی "بیاض" بھی رکھنے لگے

تسیم احمد کہتے ہیں۔ "سلیم احمد کی شاعری کا آغاز ۱۳ برس کی عمر (۱۹۳۹ء) میں ہوا اور وہ اس طرح کہ اسکول کے طلباء کا ہیڈ ماسٹر صاحب سے کچھ جھگڑا ہو گیا۔ بقول سلیم احمد، زیادتی ہیڈ ماسٹر صاحب ہی کی تھی۔ انہوں نے ہیڈ ماسٹر کے خلاف ایک مثنوی لکھی جسے لڑکوں نے نقل کر کے سکول کی دیواروں پر چسپاں کر دیا۔ اس سے ہیڈ ماسٹر صاحب اتنے گھبرائے کہ انہیں طلباء سے معافی مانگنی پڑی"۲۲

سلیم احمد پندرہ برس تھے۔ جب شاعری کا آغاز ہوا۔ ایسے میں وہ واقعہ رُونما ہُوا جو شاعری کے لئے مہمیز ہوا کرتا ہے۔ اس کی شہادت خود سلیم احمد نے بھی دی ہے۔

"بہار ایک میرے گُل جاں میں آئی
بہارِ طلسمی کہ نازِ خدائی
وہ آنکھیں ابھی جیسے نیند آ رہی ہے
ابھی جیسے دُنیا میں جا گر پڑی ہے
شفق اس کے گالوں سے سُرخی چراتی "۲۳
نمودِ سحر کی طرح مسکراتی

سلیم احمد کا داخلہ ہائی اسکول پلکھوا میں ہوا۔ پلکھوا کا ہائی اسکول ہندو غلبے کے زیر اثر تھا۔ تحریکِ آزادی میں اسکول کے پرنسپل کانگرسی نظریات کی حمایت کرتے اور اسکول کے اکثر تقریری مقابلے نیم سیاسی جلسوں میں تبدیل ہو جاتے۔ سلیم احمد اُس زمانے میں خاکسار تحریک سے بہت متاثر تھے۔ وہ تقریری مقابلوں میں اسلام کے احیاء کی بیباکانہ ترجمانی کرتے۔ دینی جماعتوں سے وابستہ افراد سلیم احمد سے بہت محبت کرتے تھے۔

فن ڈراما اور تقریر سے دلچسپی

پلکھوا ہائی اسکول میں جہاں سلیم احمد تقریری مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے اور انعام پاتے وہاں ڈراموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ یہاں نویں جماعت میں سلیم احمد نے ایک ہی ڈرامے میں دو رول ادا کیے، ایک ارجن کا اور دوسرا اگالومنی کا۔ "سلیم احمد کو تقریری مقابلوں کے ایوارڈ کے علاوہ بہترین آرٹسٹ کی شیلڈ بھی دی گئی۔"

پلکھوا میں سلیم احمد کو (نویں کی بجائے) آٹھویں جماعت ہی میں داخل کیا گیا تھا۔ اُن کا داخلہ فیض عام انٹر کالج میں بھی ۱۹۴۳ء میں آٹھویں جماعت ہی میں ہوا۔ اسی سال انہوں نے وہاں سے امتحان دیا اور نویں میں آئے۔ ۱۹۴۴ء کے وسط میں نویں اور ۱۹۴۵ء میں انہوں نے میٹرک کیا۔ اسی سال میرٹھ کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۶ء کے وسط میں فرسٹ ائیر پاس کیا۔

سلیم احمد میرٹھ کالج میں ۱۹۴۷ء میں، سیکنڈ ائیر میں پڑھ رہے تھے کہ قیامِ پاکستان عمل میں آیا اور وہ کراچی چلے آئے۔ اُنہوں نے میٹرک کا امتحان آرٹس مضامین (انگریزی، ریاضی، تاریخ، ابتدائی شہریت، اُردو اور فارسی وغیرہ) کے ساتھ پاس کیا تھا۔ چنانچہ میرٹھ کالج میں فرسٹ ائیر اور سیکنڈ ائیر میں بھی اُن کے پاس آرٹس مضامین تھے۔

سلیم احمد کی ادبی اور سیاسی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کے اظہار کے حوالے سے میرٹھ کالج میں تعلیم کا زمانہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ حُسنِ اتفاق سے اُس وقت میرٹھ کالج میں مستقبل کی کئی اہم علمی و ادبی شخصیات جمع ہو گئی تھیں۔ اساتذہ میں پروفیسر محمد حسن عسکری، پروفیسر کرار حسین، پروفیسر رزّی صدیقی اور ہم عمروں میں جمیل جالبی، انتظار حسین، یونس منصور اور کئی دوسرے اہم نام لئے جاسکتے ہیں۔ یہاں ایک علمی و ادبی تنظیم "دائرہ ادبیہ" کی نشستوں میں سلیم احمد باقاعدگی سے شریک ہوتے۔ اپنی تخلیقات پیش کرتے اور بحث مباحثے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ شاعر کی حیثیت سے وہ ہنرؔ تخلص کرتے تھے۔

شروع میں وہ اپنے اُستاد پروفیسر کرار حسین سے متاثر ہو کر خاکسار تحریک کے سرگرم کارکن

بنے تاہم پروفیسر محمد حسن عسکری کے خیالات سے بھی وہ متاثر تھے۔ عسکری مسلم لیگ کے زبردست حامی تھے۔ فیصلہ کن کردار مولانا شبیر احمد عثمانی کے خطاب نے کیا۔

مولانا عثمانی کا خطاب عام ۱۹۴۶ء میں میرٹھ میں ہوا۔ اسی وقت سلیم احمد مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اُن کے دِل میں مولانا عثمانی کی یہ دلیل گھر کر گئی کہ انہیں آزاد پاکستان میں اپنے غلبۂ اسلام کے خواب کی تعبیر جلد مِل سکتی ہے۔ ادبی، سیاسی اور ہنگامی وابستگی کی وجہ سے سلیم احمد کی نصابی تعلیم پر بھی کچھ اثر پڑا۔ انتظار حسین کہتے ہیں۔ "شاعری اور سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے وہ پڑھائی کی طرف ذرا کم ہی توجہ دیتے تھے۔"[۲۴]

پاکستان میں آمد

سلیم احمد نومبر ۱۹۴۷ء میں میرٹھ سے کراچی پہنچے۔ ہجرت کے گوناگوں مسائل کے باوجود انہوں نے اپنا ٹوٹا ہوا تعلیمی سلسلہ دوبارہ جوڑنے کی کوشش کی۔ انہی دنوں کراچی میں پرائیویٹ سیکٹر میں "اسلامیہ کالج" قائم ہو چکا تھا۔ میرٹھ کالج کے بعض اساتذہ مثلاً کرار حسین صاحب اور حسن عسکری صاحب بھی اسلامیہ کالج کے سٹاف میں شامل تھے۔ سلیم احمد نے یہاں سیکنڈ ائیر میں داخلہ لے لیا۔ لیکن فکرِ معاش سے مجبور ہو کر انہیں باقاعدہ تعلیم کا یہ سلسلہ ترک کرنا پڑا۔ بعد ازاں انہیں زندگی بھر کسی تعلیمی ادارے میں باقاعدہ روایتی تعلیم حاصل کرنے کا موقع تو نہ مِل سکا لیکن اپنی خداداد ذہانت اور شوقِ مطالعہ کی وجہ سے برابر اپنے علم وفکر میں اضافہ کرتے رہے۔

مختلف موضوعات سے متعلق کتابوں کی تلاش کے سلسلے میں وہ نہ صرف کراچی کی لائبریری میں آتے جاتے رہے تھے بلکہ دوسرے شہروں اور مُلکوں سے بھی کتابیں منگواتے رہتے تھے۔ "خوشی ہوئی کہ تم کچھ کتابیں (لندن سے) لائے ہو۔ یقیناً اہم اور قابلِ مطالعہ ہوں گی۔ ان میں کولن ولسن کی کتابیں بھی ہوں تو مجھے ان کی فوٹو سٹیٹ بھیج دینا۔ آج کل میں زیادہ تر اسی پر تکیہ کرتا ہوں۔"[۲۵]

علم وادب کی اِس سچی لگن نے ہی سلیم احمد کو سلیم احمد بنایا لیکن اس کے مفصل بیان سے پہلے اُن کی ہجرت اور اُس سے پیدا ہونے والے مسائل کا ذکر مناسب ہے۔

یوپی، مسلمانوں کا اقلیتی صوبہ تھا۔ چنانچہ دیگر اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی طرح سلیم احمد اور اُن کے خاندان کو بھی پاکستان کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ سلیم احمد قیامِ پاکستان سے کافی پہلے مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے پُرجوش حامی بن چکے تھے۔ اُن کے دل میں بھی نئے وطن کے روشن مستقبل کی اُمیدیں جگمگا رہی تھیں۔ سلیم احمد ۱۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو میرٹھ سے براستہ لاہور، کراچی پہنچے۔ اُن کا ارادہ لاہور میں رُکنے کا تھا۔ اُن کے دوست انتظار حسین بھی یہیں رہائش کا ارادہ باندھ چکے تھے"۲۶؎

کراچی میں

کراچی پہنچنے کے بعد پہلا مسئلہ سر چھپانے کا تھا۔ سلیم احمد کا خاندان پہلے پہل "پیڈر روڈ ی سوزا روڈ" پر واقع ایک فلیٹ میں رہائش پذیر ہوا۔ اسی اثناء میں خاندان کے انڈیا میں رہ جانے والے افراد خصوصاً شمیم احمد اور امّی بھی کراچی آگئے۔

ملازمتیں اور معیشت

۱۹۴۸ء میں سندھ رائس کارپوریشن میں ایک سو دس روپے ماہوار کی ملازمت سے سلیم احمد نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ یہ کوئی بہت بڑی ملازمت نہ تھی لیکن ایک قناعت پسند گھرانے کو نئے وطن میں زندگی کا آغاز کرنے کے لئے ایک مناسب سا سہارا ضرور تھی۔

جلد ہی سلیم احمد کو محکمہ بحالیاتِ مہاجرین میں کیشئر کی حیثیت سے ملازمت مِل گئی۔ یہاں اُنہیں ایک سو پچیس روپے ماہوار تنخواہ ملنے لگی۔ تنخواہ میں اضافے کے ساتھ یہاں انہیں علمی و ادبی دلچسپیوں کے لئے بھی نسبتاً زیادہ مواقع ملنے لگے۔

ان دنوں ریڈیو، پاکستان کراچی علم و ادب کا ایک اہم مرکز تھا۔ سلیم احمد کی خواہش تھی کہ وہ بھی ریڈیو سے وابستہ ہو جائیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے اُستاد محمد حسن عسکری کے خصوصی روابط سے استفادے کی کوشش بھی کی۔ عسکری اُن دنوں لاہور میں مقیم تھے۔ انہوں نے اپنے

دوست غلام عباس کو ایک خط میں لکھا۔ "صاحب! ایک چھوٹا سا کام ہے اگر آپ کر دیں تو وہ کام یہ ہے کہ میرے ایک عزیز دوست اور شاگرد ہیں سلیم احمد ویسے وہ شاعر بھی ہیں۔ تو وہ کچھ روزگار قسم کی چیز چاہتے ہیں۔" ۲۷

بعد ازاں محمد حسن عسکری ۱۹۵۰ء میں "ماہِ نو" کے ایڈیٹر بن کر کراچی آ گئے۔ شروع میں وہ سلیم احمد کے خاندان کے ہمراہ بہار کالونی والے مکان میں رہے۔ جب وہ پیر الٰہی بخش کالونی میں نسبتاً بہتر مکان میں منتقل ہو گئے تو سلیم احمد کے خاندان کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ اتنے گہرے تعلق کی وجہ سے عسکری نے سلیم احمد کے لئے دیگر جگہوں پر بھی بہتر ملازمت کے لئے کوشش کی ہو گی لیکن وہ ریڈیو کی دُنیا میں ایسے آئے کہ عمر یہیں بِتا دی۔

انہوں نے ۱۹۵۰ء میں ریڈیو کی ملازمت اختیار کی لیکن ریڈیو کراچی کے ریکارڈ کے مطابق دو باقاعدہ طور پر یکم مارچ ۱۹۵۱ء کو سٹاف آرٹسٹ (سکرپٹ رائٹر) کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ شروع میں انہیں ایک سو پچھتر روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ وقت کے ساتھ اُن کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہوتا رہا اور انہیں ترقی بھی ملتی رہی لیکن تعلیمی سند کم ہونے کی وجہ سے یہ ترقی سست رفتار تھی۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو ریڈیو کو کارپوریشن بنایا گیا تو دیگر ملازمین کی طرح سلیم احمد بھی ریگولر سروس میں آ گئے۔ ۱۰ مئی ۱۹۷۳ء سے انہیں پروڈیوسر بنا دیا گیا۔ یہاں کم از کم تعلیمی قابلیت ایم۔ اے تھی لیکن سلیم احمد کو طویل تجربے اور تعلق کے پیشِ نظر ایم۔ اے پاس ہونے کی شرط سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ ۱۸ جولائی ۱۹۷۹ء کو ترقی پا کر وہ سینئر پروڈیوسر بن گئے اور آخری وقت تک اسی منصب پر فائز رہے۔

ریڈیو کی یہ ملازمت نوٹ گننے والی سابقہ ملازمت سے بھی مشکل تر تھی۔ یہاں سلیم احمد کو سخت محنت کرنا پڑی کہ بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور مہنگائی کا مقابلہ اسی طرح ممکن تھا۔ معروف مزاح نگار اور کالم نویس نصر اللہ خاں بھی ریڈیو میں کچھ عرصہ سلیم احمد کے ساتھ رہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہم لوگ ریڈیو سے آتے تو لوگ سمجھتے مٹی ڈھو کر آئے ہیں۔" ۲۸

ریڈیو سے وابستگی کے ساتھ ساتھ سلیم احمد نے دیگر ذرائع آمدن بھی تلاش کئے۔ رسائل کی ادارت کی، فلمی کہانیاں لکھیں، ٹی وی کے لئے ڈرامے لکھے، اخبارات کے لئے مضامین اور کالم

تحریر کیے۔

سلیم احمد اُن معدودے چند لوگوں میں تھے جنہیں قلم کے مزدور کہا جاسکتا ہے۔ وہ ایسی کتابیں پڑھنا اور ایسی تحریریں لکھنا چاہتے تھے جو تخلیقی عمل کا حصّہ ہوتی ہیں۔

۱۹۷۸ء سلیم احمد کو چند ماہ کے لئے بحیثیت وفاقی مشیر اطلاعات ونشریات مقرر کیا گیا۔ اس دوران میں جہاں معاشرتی سطح پر سلیم احمد کا ایک نیا مقام ومرتبہ متعین ہوا وہاں اُن کی معاشی صورتحال میں بہتری کے بھی کچھ آثار پیدا ہوسکتے تھے۔۔۔ لیکن سلیم احمد نے اس دورِ مشاورت کو ایک آزمائش سمجھ کر گزارا۔

وہ اکادمی ادبیات پاکستان کے زیراہتمام منعقد ہونے والی مختلف کانفرنسوں، ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی وژن کے مشاعروں اور دیگر علمی وادبی تقریبات نیز بیرون ملک ہونے والی ادبی تقریبات میں بھی شریک ہوئے۔

۱۹۸۰ء میں سہیل عمر نے علم وفکر کے کسی اہم منصوبے پر بیرونِ ملک کام کرنے اور معقول معاوضہ کی پیشکش کی تو سلیم احمد نے لکھا۔ "میں کام کرنے کی پوری ذمہ داری لینے کو تیار ہوں لیکن تیس (۳۰) سالہ ملازمت کو چھوڑنا ممکن نہیں۔۔۔ ویسے اگر کام کے بارے میں کچھ تفصیلات بتا دیتے تو اچھا تھا۔"۲۹

معقول کمائی کے اچھے سے اچھے مواقع ملنے کے باوجود سلیم احمد زیادہ تر تخلیقی سرگرمیوں میں محور ہے۔ دراصل وہ مادی ترقی سے زیادہ ذہنی اور علمی وادبی ترقی کو ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا۔ "میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آرڈن کے الفاظ میں ادیب کو کوئی ایسا چھوٹا موٹا پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔ جو اِس کا زیادہ وقت نہ لے اور جس کے ذریعے وہ معاشرے میں عزّت کی ایک متوسط زندگی گزار سکے۔ اُسے نہ اتنا آرام ہو کہ سو جائے اور نہ اتنی تکلیف ہو کہ سوچنا بھی مشکل ہو جائے۔"۳۰

ریڈیو کی ۳۳ سالہ ملازمت کے دوران میں سلیم احمد کو تنخواہ ملتی رہی اور اُن کی وفات کے بعد ورثاء کو محکمانہ قواعد کے مطابق کچھ رقوم میسر آئیں لیکن اُن کی زندگی ہی میں اگر سب ذرائع سے

زیادہ آمدنی کسی ذریعہ سے ہوئی تو وہ ٹیلی وژن کا شعبہ ہے۔ ٹیلی وژن ڈراموں سے حاصل ہونے والی آمدنی اس قدر مناسب تھی کہ سلیم احمد نے اس آمدنی سے پہلی بار کراچی کی ایک نئی سرکاری رہائش سکیم "احسن آباد" میں ایک ۴۰۰ گز کا رہائشی اور ایک ۲۰۰ گز کا کمرشل پلاٹ خریدا۔ بعدازاں "گلستانِ جوہر" کے نام سے حکومت سندھ نے کراچی میں ایک اور رہائشی سکیم شروع کی تو مقصود حمیدی نے ادیبوں شاعروں کے کوٹے سے سلیم احمد کو بھی ۲۰۰ گز کا ایک پلاٹ الاٹ کیا۔ یہ ایک مہنگا پلاٹ تھا۔ جمع پونجی تو سابقہ پلاٹوں کی خریداری پر خرچ ہو چکی تھی۔ چنانچہ سابقہ ۴۰۰ گز کے پلاٹ کا آدھا حصہ بیچ کر نئے پلاٹ کی رقم ادا کی گئی۔

شعر و ادب میں پیش قدمی

قیامِ پاکستان سے پہلے بچپن اور لڑکپن کو اگر سلیم احمد کی زندگی کا پہلا دور قرار دیا جائے تو ہجرت کے بعد باقی عمر کو دوسرا دور سمجھا جا سکتا ہے۔ اِس دوسرے دور میں ملازمت اور معیشت کا ہفت خواں طے کرنے کے ساتھ ساتھ جس امر پر سلیم احمد نے سب سے زیادہ توجہ صرف کی وہ شعر و ادب میں پیش قدمی ہے۔ اُن کی یہ پیش قدمی آخری ساعت تک برابر جاری رہی۔

۱۹۴۹ء کے آغاز میں وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے باقاعدہ رُکن بن گئے۔ وہ اس کے جلسوں میں باقاعدگی سے شامل ہوتے اور نت نئے ادبی مباحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ وہ اپنے ترقی پسند دوست احمد ہمدانی اور مجتبیٰ حسین سے مزاحاً اکثر کہا کرتے تھے۔ "تم گواہ رہنا میں نے انجمن سے استعفیٰ دیا ہے نہ انجمن نے مجھے خارج کیا ہے۔" [۳۱]

سلیم احمد حلقۂ اربابِ ذوق (کراچی) کے بھی رُکن تھے۔ وہ اس حلقہ کے زیرِ اہتمام ہونے والے ادبی مباحث میں بھرپور طریقے سے حصہ لیتے تھے۔ اُن کے کئی اہم تنقیدی مضامین حلقہ کے مختلف جلسوں میں پڑھے گئے سلیم احمد نے اپنا پہلا تنقیدی مضمون "زندگی ادب میں" اُردو مرکز کراچی میں پیش کیا۔ ۱۹۴۸ء میں لکھے گئے اِس اہم مضمون سے سلیم احمد بطور نقاد متعارف ہوئے۔ ادبی شخصیات کی صحبتوں سے فیض اُٹھانے اور علمی تقریبات میں سرگرم شمولیت کے ساتھ ساتھ

اس دور میں سلیم احمد نے ادبی مطالعات بھی جاری رکھے۔ اُردو ادب کے علاوہ وہ انگریزی اور عربی ادب میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ اس سفر میں اُن کے رفیقِ دیرینہ جمیل جالبی بھی اُن سے پیچھے نہ تھے۔ جالبی کہتے ہیں۔ "شہر (کراچی) میں کئی اچھی لائبریریاں تھیں اِن کی مدد سے مطالعے کا شوق پورا ہونے لگا۔" ۳۲

انگریزی ادب کے حوالے سے سلیم احمد ایمرسن کے مضمون "SELF RELIANCE" سے بہت متاثر ہوئے۔ اس مضمون سے سلیم احمد نے یہ نکتہ پایا کہ جو باتیں خوفِ فسادِ خلق سے ہم چھُپا لیتے ہیں، انہیں دوسرے کہہ دیتے ہیں اور داد پاتے ہیں۔

رسائل کی ادارت

۱۹۴۸ء میں سلیم احمد کی علمی و ادبی پیش قدمیوں میں ایک قابلِ ذکر واقعہ ادبی رسالہ "ماہِ نیم ماہ" کا اجراء بھی ہے۔ محدود آمدنی کے باوجود ادبی پرچہ نکالنے کی کوشش جہاں ایک جراءت مندانہ قدم قرار دی جاسکتی ہے۔ وہاں وطنِ عزیز میں ادب کی بے ادبی کے حوالے سے ایک گھاٹے کا سودا بھی ہے چنانچہ مذکورہ رسالے کے صرف (۲) دو ہی شمارے منظرِ عام پر آسکے اور رسالہ بند ہوگیا۔

۱۹۵۵ء میں صوفی نذیر الہ آبادی نے کراچی سے ایک معیاری اور باتصویر رسالہ "سیارہ" کے نام سے جاری کرنے کا پروگرام بنایا۔ صوفی نذیر نے ایڈیٹر شپ کے لئے سلیم احمد کو راضی کرلیا۔ خلافِ توقع سلیم احمد کا یہ تجربہ خوشگوار رہا۔ یہیں سے صوفی نذیر سلیم احمد کو فلمی دنیا میں لے گئے۔ وہ ۱۹۵۶ء تک "سیارہ" کے مدیر رہے۔ صوفی نذیر ہی کے ایک اور رسالہ "مصوّر" میں بھی سلیم احمد نے کچھ عرصہ بطور مدیر کام کیا۔

گھر بطور ادبی مرکز

سلیم احمد کی علم و ادب سے گہری دلچسپی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ اُن کا گھر ہمیشہ ادب و شعر اور علم و حکمت کا مرکز بنا رہا۔ کراچی میں یہ شرف بہت کم گھرانوں کو حاصل رہا ہے۔ یہ گھر

بھی تھا اور چھوٹے بڑے ادیبوں شاعروں کا ٹی ہاؤس بھی ۔۔۔۔ بہار کالونی کا مکان سلیم احمد کا ابتدائی مسکن تھا۔ یہاں بڑی بڑی ادبی شخصیات آتی رہیں۔ جگر مراد آبادی، یاس یگانہ چنگیزی، محمد حسن عسکری، زیڈ اے بخاری، ڈاکٹر جمیل جالبی، جمیل الدین عالی، نہال سیوہاردی اور بہت سے دیگر اہم شعراء داد باء اس گھر کی محفلوں میں شریک رہے ہیں۔

جہانگیر روڈ کے مکان اور آخری عمر میں انچولی سوسائٹی کی رہائش گاہ پر بھی ہر مکتبہ فکر کی نامور شخصیات آتی رہی ہیں۔ سلیم احمد کا گھر ہر وقت ہر کسی کے لئے کھلا رہتا تھا۔

جوہر قابل کی تربیت

زندگی کو سمجھنا ایک اہم کام ہے مگر خود سمجھ کر دوسروں کو سمجھانا ایک اہم تر اور مشکل تر کام ہے۔ سلیم احمد نے اپنے مطالعے، مشاہدے اور تجربے سے نسلِ نو کو منتقل کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ اُن سے مکالمہ انتہائی آسان تھا۔ سلیم احمد اپنے ہمعصروں خصوصاً نئے لکھنے والوں کی مکمل راہنمائی کرتے تھے۔ وہ جہاں بھی مل جاتے، نئے لکھنے والے اُن سے اپنے دل کی بات کہنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کرتے۔ وہ ادب کا ایک چلتا پھرتا دبستان تھے۔ وہ اپنے ایک دیرینہ عزیز نوجوان کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "بس کاغذ اور قلم اُٹھاؤ اور فطری طور پر جو کچھ سوچتے یا محسوس کرتے ہوئے لکھنا شروع کر دو، اسلوب کا خیال کئے بغیر البتہ نقالی، شعوری نقالی اس وقت کرو جب مختلف اسالیب پر قابو پانے کا ارادہ کرو مثلاً دو صفحے محمد حسین آزاد اور دو صفحے رتن ناتھ سرشار کی نقل میں لکھ کر دیکھو۔ مشقیں میں نے بہت کی ہیں۔ نثر میں اور شاعری میں بھی۔ تم چاہو تو تم بھی کرو۔" ۳۳

سلیم احمد کی اِس تہذیبی خدمت کا دائرہ گھر سے لے کر ریڈیو، ٹیلی وژن، فلم، ادبی تقریبات اور دفتری مصروفیات غرض یہ کہ ہر جگہ پھیلا نظر آتا ہے۔ اُن کی تربیت سے بہت سے نئے لکھنے والے سامنے آئے۔ ان میں سے چند اہم نام اطہر نفیس، افتخار عارف، ساقی فاروقی، سہیل عمر، سراج مُنیر، شبنم صدیقی، جمال پانی پتی، شمیم احمد، زبیر ہاشمی، نسیم نیشو فوز، احمد علی سیّد، حسن اکبر کمال، عبیداللہ علیم، سلیم کوثر، جاذب قریشی، طاہر مسعود اور آصف فرّخی کے ہیں۔ مؤخر الذکر کہتے ہیں۔ "میں ریڈیو

کراچی سے بچوں کا ایک پروگرام کرتا تھا۔ انکل سلیم بھی اس پروگرام میں میرے ہیڈ تھے۔ جب کوئی موضوع چھیڑتے تو میں "یس سر، یس سر" کرتا رہتا۔ انکل سلیم کہتے "بھئی یس سر، یس سر کرتے رہتے ہو۔ میاں کوئی اختلاف کرو اور اپنی بات کہو۔" ۳۴؎

سلیم احمد کے اس بے مثل تہذیبی فرض کے بارے میں ابن الحسن کا کہنا ہے۔ "سلیم احمد ادب کے اُستادوں کی معاشرت کے آخری اُستاد تھے۔" ۳۵؎

کچھ لوگ اس کام کو سلیم احمد کی "ٹیلنٹ ہنٹنگ سکیم" بھی کہتے تھے۔ جیسا کہ اسد محمد خاں نے مزاحاً لکھا ہے۔ "شعروادب کے لکھنے والوں کے لئے سب راستے جہانگیر کوارٹرز کو جاتے تھے۔ سلیم احمد نے ایک عجیب چکّر چلا رکھا تھا۔ اُنہوں نے بہت سے ذہین اور فطین اور خطرناک آدمیوں کو ٹیلنٹ ہنٹنگ کے لئے شہر میں چھوڑ رکھا تھا۔ یہ اُن کے ٹیلنٹ سکاؤٹس تھے جو باہر کے اندھیرے پر گہری نظر رکھتے تھے اور جیسے ہی کوئی جگنو اپنی دُم چمکاتا ہوا نظر آتا یہ اُسے پکڑ کر اپنی ٹوپی میں چھپا لیتے تھے اور گُرو کے پاس لے آتے تھے۔" ۳۶؎

نہ صرف پاک و ہند میں بلکہ عالمی سطح پر بھی ادیبوں اور شاعروں کی گروہ بندی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سلیم احمد بھی اس گروہ بندی سے بچ نہیں سکے۔ دراصل اُن کے سامنے کچھ ایسے خاص علمی و ادبی اور فکری منصوبے تھے جس کے لئے وہ اپنی ٹیم تیار کرتے رہتے تھے۔ جب یار لوگوں نے اسے ٹیلنٹ ہنٹنگ کہا تو سلیم احمد نے بھی اس کا جواب طنزومزاح کے پیرائے میں دیتے ہوئے لکھا۔

> "خُدا جانے کیسے پولیس سے بچا ہوں۔ شکاگو کے میں گینگروں کا چچا ہوں، وہ ہتھکنڈے میرے کہ بچ کر نہ جائیں، ادب کی فضا میں جو ٹیلنٹ آئیں، بڑا زعم ہے مجھ کو میں مستند ہوں، سند بانٹتا ہوں کہ خود بے سند ہوں۔"

زنجیرِ محبت

سلیم احمد ریڈیو پاکستان میں ملازم تھے، فلمی کہانیاں لکھنے لگے تھے، رسائل کی ادارت کر رہے تھے اور ہمہ تن شعروادب میں محو تھے لیکن شعروادب میں ایک اور شے بھی ہوتی ہے۔ غالب کے بقول

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں بادہ و ساغر کہے بغیر

سلیم احمد نوجوان تھے، خوبرو تھے اور شاعری کے دلدادہ۔ اس صورت حال میں جاننے والے اُس قوت محرکہ کا سُراغ بھی لگانا چاہتے ہیں جو شعر کو حُسن، رنگ اور ابدیت عطا کرتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک بیان اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ وہ لکھتے ہیں۔ "سلیم احمد نے عشق اپنی عمر سے خاصی بڑی "محبوبہ" کے ساتھ کیا ہے۔ اسی لئے سلیم احمد کے عشق میں عنفوان شباب کا اُبال نہیں ہے۔"۳۷ سلیم احمد کے بھی رومانی جذبات تھے لیکن یہ حیرت انگیز امر ہے کہ انہوں نے آغاز جوانی ہی میں ان رومانی جذبات میں سنجیدگیٔ فکر شامل کر لی تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی چلی گئی۔ انہوں نے اپنے رومانی جذبات کو پوری شخصیت اور پوری زندگی کا عشق بنالیا تھا۔ وہ رومانیوں اور ترقی پسندوں کے اس لئے بھی مخالف رہے کہ ان کے یہاں عشق پوری شخصیت کو متاثر نہیں کرتا۔ اس کے جواب میں انتظار حسین کا کہنا ہے۔ "میرٹھ کے زمانے میں بظاہر تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ شعروشاعری اور سیاسی مصروفیات کی وجہ سے ایسا کوئی رومانس تو نظر نہیں آتا تھا مگر میرا خیال ہے خاندان کے اندر ہی کوئی ایسی بات تھی۔ "۳۸ شمیم احمد کہتے ہیں۔ "میں اب مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ وہ خاتون بھی اب پوتوں اور نواسوں والی ہوگئی ہیں۔ ویسے بھی یہ گھر کا معاملہ تھا۔"۳۹

سیاسی نظریات میں تبدیلی

سلیم احمد شروع میں خاکسار تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔ بعدازاں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا میرٹھ میں خطاب سُنا تو نظری اور عملی طور پر مسلم لیگ کے پُرجوش حامی بن گئے۔ قیام پاکستان کے بعد جب صفِ اوّل کے قائدین دو چار برسوں میں اللہ کو پیارے ہوگئے تو مسلم لیگی قیادت سخت انتشار کا شکار ہوگئی۔ نتیجہ ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کی صورت میں نکلا۔

سلیم احمد کے سیاسی نظریات میں آخری تبدیلی اُس وقت آئی جب ۱۵ مئی ۱۹۸۱ء کو روزنامہ

"جسارت" کراچی میں سلیم احمد کا ایک متنازعہ انٹرویو شائع ہوا۔ اکابرینِ جماعتِ اسلامی نے وضاحت چاہی تو سلیم احمد نے جسارت اور جماعت سے علیحدگی اختیار کرلی۔"۴۰"۴۱

سلیم احمد سیاست کو ادیبوں کے لئے شجرِ ممنوعہ نہیں سمجھتے تھے مگر وہ چاہتے تھے کہ ادیب وشاعر پارٹی پالیٹکس سے بلند تر ہوکر سوچیں۔ اگرچہ وہ خود خاکسار تحریک، مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی کے ساتھ ہمہ تن وابستہ رہے لیکن عمر بھر کے تجربے کے بعد آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک ادیب اور شاعر کو کسی مخصوص پارٹی کا تابع مہمل بن کر نہیں رہنا چاہیے۔ اُن کا خیال تھا کہ پارٹی پالیٹکس کا شکار ہوکر ادیب اپنی بینائی کا سودا کرلیتا ہے۔ بقول سلیم احمد "ہمارا ادیب جن اسباب سے خراب ہوا اُن میں ادیبوں کی یہ کمزوری پارٹی پالیٹکس بھی شامل ہے۔"۴۲

نروس بریک ڈائون

تیس پینتیس برس کی عمر کو پہنچتے تک سلیم احمد بیمار رہنے لگے تھے۔ ان پر نروس بریک ڈاؤن کا شدید حملہ ہوا۔ سال میں دو چار بار، ہفتہ ہفتہ بھر کے لئے بیمار رہنے کا ذکر اُن کے مختلف خطوط میں ملتا ہے۔ ساقی فاروقی کے نام ایک طویل خط کے چند اقتباسات قابلِ غور ہیں۔ "میں کبھی شعور کی گرفت میں ہوتا ہوں اور کبھی لاشعور کی ۱۵ سے ۱۹ سال کی عمر تک مجھ پر ایک ایسا وقت گزرا جب میں شعور کی گرفت سے نکل کر لاشعوری محرکات سے مغلوب ہوا"۴۳

"۵۷ء تک میری یہی کیفیت تھی۔ ۵۸ء سے ۶۱ء تک مجھ پر لاشعوری اثرات غالب آگئے اور تمہیں شاید یہ سُن کر حیرت ہو کہ میں نے "نئی نظم اور پورا آدمی" لاشعور کی مکمل گرفت کی حالت میں لکھی ہے۔"۴۴

شادی اور اولاد

یہ تعجب انگیز امر ہے کہ سلیم احمد نے پینتیس چھتیس برس تک شادی کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ ایسا بھی نہیں کہ چوری چھپے کہیں کوئی رومانس لڑا رکھا ہو۔ اس معاملے میں وہ میرؔ تھے، غالبؔ نہیں یعنی

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو، والا معاملہ تھا۔ اس سلسلے میں اُن کے دوستوں اور دشمنوں کی یکساں رائے ہے۔ یُوں کہیے کہ وہ عملی زندگی کے جھمیلوں میں اس قدر محو ہو گئے کہ شادی کے لئے سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔

سلیم احمد کی شادی ۱۹۶۴ء میں ہوئی۔ اس شادی کی بارات نہایت مختصر تھی آپا اور بہن زاہدہ گاڑی کے ذریعے انڈیا چلی گئیں اور سلیم احمد ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی سے کیرانہ پہنچے۔ نکاح کے دو تین دن بعد سلیم احمد ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی لوٹ آئے۔ دو ماہ بعد دلہن بھی کراچی آ گئیں۔ سلیم احمد اس شادی سے بہت مطمئن تھے اور اس کا ذکر بھی اپنے خاص دوستوں سے کرتے رہتے تھے۔

سلیم احمد کے ہاں چھ بچے قرۃ العین سلیم، سعدیہ سلیم، عدنان سلیم، سلمٰی سلیم، کامران سلیم اور صبا سلیم (۲ بیٹے اور ۴ بیٹیاں) پیدا ہوئے۔

کالم نگاری

کالم نگاری کی صورت میں سلیم احمد کی ایک اور صلاحیت منظر عام پر آئی۔ ۱۹۶۶ء میں اُنہوں نے روزنامہ حریت کراچی میں پہلی بار کالم لکھنا شروع کیا۔ "مجھے کہنا ہے کچھ" کے عنوان سے لکھا گیا یہ ابتدائی کالم ادبی نوعیت کا ہوتا تھا جو ہفتے میں ایک بار چھپتا تھا۔

۱۹۶۹ء میں کراچی سے روزنامہ جسارت کے اجراء کے موقع پر سلیم احمد اور اُن کے بھائی شمیم احمد نے ہر طرح سے قلمی تعاون کیا۔ سلیم احمد اخبار مذکور میں "روبرو" کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔ اسی دور میں سلیم احمد نے ہفت روزہ "زندگی" میں بھی کبھی اپنے نام سے اور کبھی کسی قلمی نام سے سیاسی نوعیت کے کالم لکھے۔

ٹیلی وژن سے وابستگی

پاکستان ٹیلی وژن کی نشریات کا آغاز ۱۹۶۴ء میں لاہور سے ہوا۔ کراچی سینٹر نے اپنی نشریات ۱۹۶۷ء میں شروع کیں۔ سلیم احمد آغاز ہی سے کراچی ٹیلی وژن سینٹر سے وابستہ ہو گئے۔ اُن کے

ساتھ ریڈیو، فلم اور سٹیج کا وسیع تجربہ تھا۔ کراچی ٹی وی کی نشریات شروع ہونے کے تیسرے دن جو پہلا ڈراما ٹیلی کاسٹ کیا گیا وہ سلیم احمد ہی کا لکھا ہوا تھا۔ آصف فرخی کا بیان ہے۔

"HE WAS INVOLVED WITH T.V. RIGHT FROM ITS INCEPTION. FIRST PLAY TO BE TELECASTED FROM KTV WAS THE ONE WRITTEN BY HIM"۴۵

ٹیلی وژن کے لئے سلیم احمد نے ۱۹۷۶ء میں بانی پاکستان محمد علی جناح کے صد سالہ جشن ولادت کے حوالے سے ایک سلسلہ وار ڈراما "تعبیر" لکھا۔ تحریکِ پاکستان کے منظر اور پس منظر کو اُجاگر کرنے میں اس ڈرامے نے اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے نسیم حجازی کے ناول "آخری چٹان" اور "شاہین" کی ڈرامائی تشکیل بھی کی۔ سلیم احمد نے ڈراموں کے علاوہ ٹیلی وژن پر پیش کئے جانے والے مشاعروں، دینی پروگرام اور دیگر علمی و ادبی تقریبات میں شرکت اور کمپیئرنگ بھی کی۔

اُن کے یہ تمام مشاغل ظاہر کرتے ہیں کہ سلیم احمد بیماری کے باوجود زندگی کا بارِ گراں بڑی خوش اسلوبی سے اُٹھانے میں کوشاں رہے۔

سقوط ڈھاکہ کے اثرات

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دُنیا کے نقشے پر ابھرنے والی سب سے بڑی اسلامی مملکت ۲۵ سال کے اندر اندر دولخت ہوگئی۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں فاتح بھارتی جرنیل کے سامنے پاکستان کی شکست خوردہ افواج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سلیم احمد پاکستان سے بے پناہ محبت کرنے والے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے تاریخ کا ایک بھیانک منظر دیکھ رہے تھے۔ اُن کے دل و دماغ پر اس حادثے کا اس قدر گہرا اثر ہوا کہ وہ کئی روز تک گھر سے باہر نہیں نکلے۔ اُن پر نروس بریک ڈاؤن کا ایک اور سخت حملہ ہوا۔ درج ذیل خط میں سلیم احمد کا کرب ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ "سنگدل تماشائی ہنس رہے ہیں، انسان بھی کیا چیز ہے نظیر! پاکستان ختم ہوگیا۔ سب سے بڑی مملکت ختم ہوگئی۔

قائدِ اعظم کے مزار کی طرف دیکھا نہیں جاتا۔ قائدِ اعظم تب نہیں مرے تھے، اب مرے ہیں۔"[۴٦]

"ذاتی تلخیاں کیا کم تھیں کہ پاکستان کے معاملے نے پورے وجود ہی میں زہر گھول کر رکھ دیا۔"[۴٧]

تاہم ۱۹۷٦ء میں سلیم احمد کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کرنے لگے تھے۔ لکھنے پڑھنے سے مراد تخلیقی سرگرمیاں ہیں۔ ان دنوں حلقہء ارباب ذوق (کراچی) میں انہوں نے "نئی شاعری، نامقبول شاعری" کے عنوان سے ایک طویل مضمون پڑھا جس پر کافی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ سلیم احمد نے یہ مضمون چھپنے کے لئے رسالہ "فنون" میں بھی بھیجا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پھر سے لکھنے لکھانے کی طرف لوٹ رہے تھے۔

۱۹۷۷ء میں انہوں نے اپنی کتابیں "اقبال ۔ایک شاعر" اور "محمد حسن عسکری"، "آدمی یا انسان"، مکمل کیں۔

بحیثیت وفاقی مشیر اطلاعات

سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات اور ذہنی جمود سے باہر نکلنے میں جہاں گزرانِ وقت کے مرہم نے کام کیا۔

سلیم احمد نے یہ مختصر سا عرصہ جو کہ اُن کی زندگی کا "اعلیٰ اختیارات" کا حامل عرصہ تھا، نہایت دانشمندی اور دیانتداری سے گزارا۔

سلیم احمد کے لئے مُشیر بننا ایک اعزاز بھی تھا اور آزمائش بھی۔ چنانچہ انہوں نے جہاں اپنے سیاسی نظریات کی پاسداری کی وہاں دُنیائے ادب کی اخلاقیات کو بھی نہیں بھولے۔ اس دور میں معروف شاعر جوش ملیح آبادی پر پابندی لگائی گئی تو سلیم احمد نے اس حکم کے خلاف اپنا اختلافی نوٹ حکومت کو بھجوایا۔

پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

"جب سلیم احمد وزارت اطلاعات کے مشیر مقرر ہوئے اور "جسارت" کا نامہ نگار یونیورسٹی (قائد

اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد) سے میری برطرفی کا مطالبہ کرنے لگا۔ ان حالات میں بھی سلیم احمد کی گرم جوشی میں کمی نہ آئی۔ اگر وہ ایک دن کے لئے بھی اسلام آباد آتے تو نظیر صدیقی کو ساتھ لے کر مجھے ڈھونڈتے پھرتے۔"۴۸؎

وفات سے پہلے ۔ چند اہم واقعات

سلیم احمد نے یوں تو ساری عمر ہی علمی ادبی ہنگاموں میں گزاری لیکن آخری چند برسوں میں یہ ہنگامے تیز تر ہو گئے تھے۔ علم ادب کے ساتھ ساتھ مذہب اور سیاست سے جو دلچسپی بچپن میں پیدا ہو گئی تھی وہ وقت کے ساتھ زیادہ ہوتی چلی گئی۔

۱۹۸۲۔۸۳ء میں یکے بعد دیگرے کچھ ایسے واقعات بلکہ سانحات رونما ہوئے جنہوں نے سلیم احمد کو بہت آزردہ کر دیا تھا۔ اُن کے بہنوئی عزیز ہاشمی کا انتقال ۱۹۸۲ء میں ہُوا۔ سلیم احمد عزیز سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "محمد حسن عسکری، آدمی یا انسان" کا انتساب بھی عزیز ہاشمی کے نام کیا ہے۔ مرحوم کی وفات سے جہاں علم وادب کا ایک روشن ستارہ ٹوٹ گیا، وہاں بہن اور اس کے بچوں کی فکر بھی سلیم احمد کو پریشان کر رہی تھی۔

شمیم احمد بڑی مشکلوں سے تبادلہ کروا کے کوئٹہ سے جنوری ۸۳ء میں کراچی یونیورسٹی میں آگئے جس سے سلیم احمد کو ایک گونہ طمانیت حاصل ہوگئی۔

۱۹۸۲ء میں "فنون" میں حسن عسکری اور اُن کی جدیدیت دشمنی کے خلاف ایک محاذ کھولا گیا۔ اس سلسلے میں "محمد ارشاد" نے حسن عسکری پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ جبکہ جمال پانی پتی، سراج مُنیر اور سہیل عمر وغیرہ نے عسکری کا بھرپور دفاع کیا۔ یہ علمی جنگ ناگوار صورت اختیار کرنے والی تھی کہ "فنون" نے اس بحث مباحثے کو بند کر دیا۔ آخری دنوں میں سلیم احمد کو اس "چاند ماری" کا بھی قلق تھا۔

آخری چند برسوں میں سلیم احمد نے دیگر نامور شعراء کے ہمراہ کویت (جون ۱۹۸۱ء)، ابوظہبی اور دبئی (۱۹۸۳ء) اور مسقط (اگست ۱۹۸۳ء) کے مشاعروں میں بھی شرکت کی۔ ان کے علاوہ اندرون ملک بھی اعلیٰ پیمانے پر منعقدہ کئی تقریبات میں شرکت کی۔ فروری ۸۳ء میں سلیم احمد

اور شمیم احمد کے ساتھ شام ہلالِ احمر کے عنوان سے حیدر آباد سندھ میں ایک یادگار شام منائی گئی۔
متعدد معروف اہل قلم نے دونوں بھائیوں سے ذاتی، قومی، علمی اور ادبی سوالات پوچھے۔

۱۳ اگست ۸۳ء کو ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے زیر اہتمام منعقدہ قومی مشاعرے میں شرکت کی۔ ۱۴ اگست ۸۳ء کو پاکستان ٹیلی وژن میں کلام سُنایا۔

سلیم احمد کی وفات سے پہلے دُکھ دینے والا ایک واقعہ ساقی فاروقی کی طرف سے پیش آیا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ساقی فاروقی کراچی کی ادبی دنیا میں ایک نووارد تھا وہ اکثر بیشتر سلیم احمد کی ادبی بیٹھک میں آتا جاتا رہتا تھا۔

سلیم احمد نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے تھے۔ انہوں نے ساقی کے ادبی جوہر کو نکھارا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد لندن چلا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ ادبی مطالعے اور ماحول سے بڑے ادباء میں شمار ہونے لگا۔

سلیم احمد کے دوسرے مجموعہ کلام "اکائی" کی اشاعت میں بوجوہ تاخیر ہو رہی تھی۔ سلیم احمد نے ساقی سے کہا کہ وہ ان کی کتاب کا دیباچہ لکھے۔ اُس نے دیباچہ لکھنے میں کافی دیر لگائی اور جب مذکورہ تحریر سلیم احمد کے پاس آئی تو اس میں سلیم احمد کی شاعری کا اچھا خاصا پوسٹ مارٹم کیا گیا تھا۔ سلیم احمد تو اس دیباچے کو کتاب میں شامل کرنے کا شاید حوصلہ کر لیتے لیکن کتاب کے ناشر اطہر نفیس کو ساقی فاروقی کی یہ تحریر پسند نہ آئی۔ سلیم احمد کو ساقی فاروقی سے ایسی گستاخی کی توقع نہ تھی، انہیں اس بات کا شدید رنج ہوا۔

عبید اللہ علیم کو سلیم احمد نے بڑی چاہتوں سے پالا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں سلیم احمد اور عبید اللہ علیم کے درمیان کسی بات پر چپقلش ہو گئی جسے بعض بدخواہوں نے لگائی بجھائی کر کے اور بھی بڑھا دیا۔ سلیم احمد نے تو علیم کی کتاب "چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں" کا فلیپ بھی لکھا تھا۔ اس ادبی مجادلے کا خاتمہ یُوں ہوا کہ سلیم احمد کی وفات سے ایک دن پہلے، ۳۱ اگست ۸۳ء کو علیم کی طرف سے ایک غیر مشروط معافی نامہ سلیم احمد کو بھیجا گیا۔ اس دن یہ کھُلا معافی نامہ کراچی کے اخبارات میں بھی شائع ہوا۔ سلیم احمد نے بھی صمیم قلب کے ساتھ علیم کو معاف کر دیا۔

وفات سے چند دن پہلے وہ دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں سے ملنے کے لئے بے چین رہنے لگے تھے۔ وفات سے چند گھنٹے پیشتر سلیم احمد کو جو آخری خوشخبری ملی وہ اُن کے دوست ڈاکٹر جمیل جالبی کے وائس چانسلر (جامعہ کراچی) بننے کی خبر تھی۔ انہوں نے شمیم احمد کے ساتھ پروگرام طے کیا کہ یکم ستمبر (۸۳ء) کو ڈاکٹر جالبی کو مبارکباد دینے جائیں گے اور ۲ ستمبر کو پروفیسر کرّار حسین کے ہاں جائیں گے۔

وفات حسرت آیات

آخری ایام میں سلیم احمد کی صحت معمول کے مطابق تھی۔ بیمار تو وہ ایک عرصے سے تھے اور اس بیماری کے اثرات اُن کے پھولے ہوئے جسم، ورم آلود ہاتھ پاؤں، بدلی ہوئی رنگت اور سُوجے ہوئے پپوٹوں سے ظاہر تھے لیکن فوری طور پر زیادہ تشویشناک صورتحال بھی نہ تھی۔ لیکن سلیم احمد مستقبل کے بہت سے منصوبوں کو نامکمل چھوڑ کر ۳۱ اگست اور یکم ستمبر ۱۹۸۳ء کی درمیانی شب اس عالمِ فانی سے کوچ کر گئے۔

اب اس کے سوگ میں کچھ اور کیا کہیں ہم لوگ کہ مرنے والا تو ہم سے زیادہ زندہ تھا۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق سلیم احمد کو صبح نہ جگایا گیا۔ خیال تھا کہ وہ نو دس بجے خود ہی اُٹھ جائیں گے مگر جب گیارہ بارہ بج گئے تو گھر والوں کو تشویش ہوئی۔ اُن کے کمرے میں جا کر دیکھا تو سلیم احمد اس دُنیا سے جا چکے تھے۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلیہ راجعون؛

ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ سلیم احمد کی روح نے صبح کے وقت کسی لمحے عالمِ جاودانی کی طرف پرواز کی ہوگی۔ اُن کی وفات کی خبر تقریباً تمام قومی اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی وژن سے نمایاں طور پر نشر کی گئی۔ مرحوم کی نمازِ جنازہ میں ہر شعبہء زندگی خصوصاً دانشوروں، پروفیسروں، ادیبوں اور شاعروں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ سلیم احمد کو پاپوش نگر کراچی کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

قطعات وفات

سلیم احمد کی وفات حسرت آیات کے بعد متعدد شعرائے کرام نے قطعاتِ تاریخ وفات لکھے۔ مظفر علی سیّد نے کہا۔

آخر ہوئی گرداب کی گردش خاموش
ریائے زندگی کی شورش خاموشی

اب بحث و گفتگو کا در بند ہوا
سیّد نے کہا، صاحبِ دانش خاموش

۱۴۰۳ھ

لب بستہ ہوا ہے بابِ اسلام صحیح
وہ دیکھ رہا تھا خوابِ اسلامِ صحیح
ذی عقل و صاحبِ ذوقِ سلیم
تھا مظہرِ انقلاب اسلامِ صحیح

۱۹۸۳ء(**محشر بدایونی**)

وہ کیا گیا کہ بجھ سا گیا شہر علم و فن
ایسا تو کوئی گم ہی شگفتہ مزاج ہے
کی فکر ِ مرگ تو آئی صدائے غیب
باغِ جناں کی جان سلیم احمد آج ہے

۱۴۰۳ھ

انور جاوید نے مصرعِ تاریخ وفات یُوں کہا۔ آہ! پیغمبر سخن و ادب ۱۹۸۳ء

وفات کے بعد خراجِ تحسین

سلیم احمد کی وفات کے بعد متعدد سرکاری، علمی اور ادبی شخصیات نے مرحوم کی بیوہ اور بھائی

شمیم احمد کے نام تعزیتی پیغامات ارسال کئے جن میں سلیم احمد کی اعلیٰ علمی و ادبی اور قومی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل مسیح الدین احمد صدیقی کے علاوہ مشفق خواجہ، احمد ندیم قاسمی، نصراللہ خاں، ڈاکٹر جمیل جالبی، جمیل الدین عالی، نعیم صدیقی، اسعد گیلانی، محمد صلاح الدین اور عطاء الحق قاسمی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ جنگ، جسارت، حریت اور نوائے وقت کے علاوہ متعدد قومی اور علاقائی اخبارات و جرائد نے سلیم احمد کی یاد میں خصوصی ایڈیشن شائع کئے۔ ادیبوں اور دانشوروں نے مختلف شہروں میں تعزیتی اجتماعات منعقد کئے اور تعزیتی قراردادیں منظور کیں۔ مشفق خواجہ، احمد ندیم قاسمی، نصراللہ خاں اور عطاء الحق قاسمی نے مختلف کالموں میں سلیم احمد کی زندہ جاوید ادبی خدمات کا شاندار لفظوں میں ذکر کیا۔ پاکستان ٹیلی وژن کراچی سینٹر نے ۳ ستمبر کی شب "چراغ نیم شب" کے عنوان سے مرحوم کی یاد میں ایک خصوصی پروگرام ٹیلی کاسٹ کیا۔

سلیم احمد کے قریبی دوستوں نے "سلیم احمد ٹرسٹ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس ٹرسٹ کے اوّلین مقاصد میں مرحوم کی مطبوعہ کتب کی فروخت، اِن کتابوں کے نئے ایڈیشنوں کی اشاعت، چھ غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کا انتظام، مختلف اخبارات و رسائل میں بکھری ہوئی تحریروں کی ترتیب و اشاعت اور پسماندگان کی کفالت کے لئے باوقار ذرائع کی دریافت شامل تھا۔ "سلیم احمد ٹرسٹ" کے صدر پروفیسر کرار حسین اور معتمد اطہر زیدی (اکاؤنٹنٹ جنرل حکومت سندھ) مقرر ہوئے جبکہ محمد صلاح الدین ((مدیر جسارت/تکبیر) خازن تھے۔ اِن کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی، نصیر سلیمی، جمیل الدین عالی، غلام احمد اسمٰعیل اور شمیم احمد ارکان نامزد کئے گئے۔ اس ٹرسٹ نے پسماندگان کے لئے ایک عدد مکان کی تعمیر مکمل کرائی ہے نیز سلیم احمد کے کالموں کا ایک انتخاب "اسلامی نظام، مسائل اور تجزیے" بھی کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

سلیم احمد کی یاد میں اُن کے دوستوں نے "حلقہ سلیم احمد" کے نام سے ایک علمی و ادبی فورم بھی قائم کیا، جس کے روح رواں مرحوم کے ساتھی جمال پانی پتی تھے۔ ان کے علاوہ جاذب قریشی،

طاہر مسعود اور صفدر صدیق رضی بھی معاونت کرتے رہے۔ شروع شروع میں تو "حلقہ سلیم احمد" کے زیر اہتمام علمی و ادبی نشستیں ہر ہفتے باقاعدگی سے منعقد ہوتی رہیں لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

سلیم احمد کی برسی کے موقع پر ہر سال یکم ستمبر کو ایک باوقار اور اعلیٰ درجے کی تقریب کا اہتمام بھی کیا جاتا رہا۔ اس کے منتظمین میں شمیم احمد، جمال پانی پتی، طاہر مسعود اور خاور جمیل کے علاوہ متعدد دوستوں کے نام شامل ہیں اس تقریب میں ہر سال پاکستان کی نامور ادبی شخصیات کو مدعو کیا جاتا رہا۔ اس کی ایک خاص بات سلیم احمد کی کسی کتاب کے نئے ایڈیشن یا کسی نئی کتاب کی رُونمائی بھی ہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۸۹ء تک چلتا رہا۔

ادبی مجلّہ ''رسالہ'' حیدر آباد (سندھ) کے مدیران نے ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں سلیم احمد کی شخصیت اور فکر و فن کے لئے ایک گوشہء خاص وقف کیا۔ ''رسالہ'' کے مدیران میں حبیب ارشدؔ، عتیق جیلانی اور قمر مشتاق شامل ہیں۔

لاہور سے شائع ہونے والے ایک اعلیٰ علمی و ادبی میگزین "روایت" نے ۸۷-۱۹۸۶ء میں سلیم احمد کی یاد میں دو خصوصی اشاعتیں پیش کیں۔ اس سلسلے میں شمیم احمد، جمال پانی پتی، سراج منیر اور تحسین فراقی نے خصوصی تعاون کیا۔ "روایت" کے مدیر محمد سہیل عمر ہیں۔ وہ جب ایم اے کے طالب علم تھے تو اُن کے مقالہ "محمد حسن عسکری" کے حوالے سے سلیم احمد نے خصوصی شفقت اور علمی سرپرستی کی تھی۔ گیارہ سو صفحات پر مشتمل "روایت" کے "سلیم احمد نمبر" کی صورت میں محمد سہیل عمر نے سلیم احمد کا یہ علمی قرض اُتارنے کی سعی کی ہے۔ لکھتے ہیں۔ "رنج اور بھی تھے مگر سلیم بھائی کا یوں جانا سانحے سے کم نہ تھا۔ اِن کا غم تو جان کے ساتھ ہے لیکن اس ادھوری ملاقات کا قرض اگر روایت سوم اور چہارم سے ادا ہو سکا تو یاری پر استواری کی مہر ثبت ہو جائے گی۔"

۸۵ء میں سلیم احمد کی شخصیت اور فن پر ایم۔اے کی سطح کا ایک مقالہ شعبہء اُردو، جامعہ پنجاب لاہور میں لکھا گیا۔ مقالہ نگار عارف محمود ثاقب اور نگران ڈاکٹر سجاد باقر رضوی تھے۔ ابتدائی سطح پر یہ اچھی کوشش ہے۔

۱۹۸۶ء میں جاذبؔ قریشی نے اپنے تنقیدی مجموعہ مضامین "آنکھ اور چراغ" کا ایک تہائی حصہ سلیم احمد کی شخصیت اور فن کے لئے وقف کیا۔ یہ کُل پانچ مضامین ہیں۔ جاذبؔ نے سلیم احمد کے حوالے سے ایک مکمل کتاب لکھنے کا اعلان بھی کر رکھا ہے۔

مشرف احمد نے "سلیم احمد" کے عنوان سے مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کے لئے ۱۹۸۹ء میں ایک سلسلۂ کتابیات بھی مرتب کیا ہے۔

شاہنواز فاروقی نے "سلیم احمد کی کالم نویسی" کے عنوان سے ۹۰۔۱۹۸۹ء میں شعبہء ابلاغیات جامعہ کراچی کی طرف سے ایم۔اے کی سطح کا ایک مقالہ سپردِ قلم کیا۔ نگران نثار احمد زبیری تھے۔ اپنے موضوع کے حوالے سے یہ ایک اچھی کوشش ہے۔

اِن کے علاوہ پاکستان کی مختلف جامعات اور عالمی سطح پر کئی علمی وادبی اداروں مثلاً علی گڑھ یونیورسٹی (بھارت) اور شکاگو یونیورسٹی (امریکہ) میں بھی سلیم احمد کی شخصیت اور فن پر تحریریں چھپتی رہی ہیں۔

ماہنامہ "الفاظ" کراچی شمارہ مئی جون ۱۹۸۲ء میں، سلیم احمد کی زندگی میں ہی، اُن کے فکر وفن کے لئے ایک گوشہ خاص وقف کیا گیا تھا۔ اس شمارے میں سلیم احمد کے چند یادگار مضامین اور اُن کے حوالے سے ایک بحث شامل تھی۔ سلیم احمد کی زندگی میں اُن پر کسی بھی رسالے کی پہلی خصوصی اشاعت تھی۔ زندگی کی نسبت اُن کی وفات کے بعد اُن کے فکر وفن اور شخصیت پر زیادہ لکھا گیا۔

انتسابات

سلیم احمد کی وفات کے بعد شائع ہونے والی مختلف شعری اور نثری تصانیف کو سلیم احمد کے نام معنون کیا گیا۔

۱۹۸۴ء میں حمایت علی شاعر نے اپنی تنقیدی کتاب "شخص وعکس" ۴۹ کا انتساب درج ذیل الفاظ میں کیا ہے۔ "سلیم احمد کے نام۔۔۔

"وہ ایک شخص کہ سایہ بھی تھا اُجالا بھی — ہر اختلاف کا مرکز رہا مگر پھر بھی

رقابتوں میں محبت کا تھا حوالہ بھی" ۔۔۔۔حمایت علی شاعر"

۱۹۸۵ء مرحوم کی بیٹی قرۃ العین سلیم نے اپنے انشائیوں کی مختصر سی کتاب "عینی کے انشائیے" ۶۰ کا انتساب "ابو جان کے نام" کیا۔ ۱۹۸۷ء میں باسط عظیم نے اپنے شعری مجموعہ "حروف" کو سلیم احمد کے نام درج ذیل الفاظ کے ساتھ معنون کیا۔ "اپنے مرشد ۔۔۔ سلیم احمد کے نام

ایک ٹھنڈک تھی اس کی چھاؤں میں

اک شجر تھا وہ سایہ دار بہت

۱۹۸۹ء میں اعجاز رضوی نے اپنے خاکوں کے مجموعے "کلوز اپ" ۵۰ کا آغاز سلیم احمد کے ایک شعر سے کیا۔

بڑھ گئی بات تو دل کو مرے الزام نہ دے

سخن آغاز کیا تیری نظر نے پہلے

☆ شمیم احمد نے ۱۹۸۹ء میں شائع ہونے والے تنقیدی مضامین کے مجموعہ "سوال یہ ہے؟" ۵۱

کو اپنے مرحوم بھائی کے نام کیا ہے ۔ الفاظ یہ ہیں۔ بھائی صاحب کے نام ۔۔۔

کون سی رات آپ آئیں گے

دن بہت انتظار میں گزرے

☆ ۱۹۸۵ء میں چھپنے والے ضخیم ادبی مجلّہ "معاصر" ۵۲ لاہور کی ایک خصوصی اشاعت کو جزوی طور پر سلیم احمد کے نام منسوب کیا گیا۔ مکمل انتساب سلیم احمد اور فتح محمد ملک دونوں کے نام ہے۔

مختلف شعراء و ادباء کے انٹرویوز پر مشتمل کتاب "حرفِ من و تو" ۵۳۔ ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ مرّتب ڈاکٹر آصف فرخی ہیں۔ انہوں نے درج ذیل لفظوں کے ساتھ یہ کتاب سلیم احمد کے نام معنون کی۔ سلیم احمد کے نام ۔۔۔ "جنہوں نے اپنے کمرے کی دیواروں پر مولانا رومؒ کا یہ شعر آویزاں کر رکھا تھا۔"

کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلہ وبے شرمی است

فی زمانہ جبکہ ہماری ادبی ثقافت مصرعۂ ثانی کی قائل ہوتی جارہی ہے۔ان کی زندگی کارِ مرداں سے عبارت رہی۔روشنی اور گرمی کی ایسی مثال کہ جس سے من وتو کے درمیان حرف کا رشتہ استوار رہتا ہے۔

☆ ماہنامہ ''اسلوب'' کراچی (اشاعت اکتوبر ونومبر ۱۹۸۳ء) کی طرف سے ''تخلیقی ادب'' کے عنوان سے شمارہ خصوصی نمبر ۳ کی صورت میں ایک ضخیم نمبر پیش کیا گیا جس میں برِصغیر پاک وہند کے صف اوّل کے لکھنے والوں کی تحریریں شامل کی گئیں۔اس خصوصی اشاعت کو محمد ہادی حسین، سکندر علی واجد اور سلیم احمد کے نام معنون کیا گیا۔

شامِ سلیم احمد۔ریاض، سعودی عرب میں ۲۶ مئی ۱۹۸۶ء، سلیم احمد کے نام سے موسوم ایک محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی جس کی روداد، ماہنامہ قومی زبان، کراچی، شمارہ جون ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر شمس الدین عثمانی نے اپنی کتاب "محبت وطن، پریم چند اور دیگر مضامین" میں "نظیر کی شناخت" نامی مضمون کے نیچے لکھا ہے۔سلیم احمد کی یاد میں۔ ہندوستان میں چھپنے والی یہ پہلی کتاب ہے جس کا جزوی انتساب سلیم احمد کے نام ہے۔

سلیم احمد کی شخصیت

آدمی بن کے مرا آدمیوں میں رہنا
اک الگ وصف ہے درویشی و سلطانی سے

ظاہری شخصیت

جب سلیم احمد کی شخصیت کا جائزہ لیں تو یہ تعجب انگیز حقیقت سامنے آتی ہے کہ اُن کے بچپن اور لڑکپن میں اُن کی جو ظاہری و باطنی شخصیت پروان چڑھی، وہی عمر بھر اپنی توسیع کرتی رہی۔

جہاں تک سلیم احمد کے سراپا کا تعلق ہے تو وہ بچپن میں دُبلے پتلے اور چھریرے بدن کے حامل

تھے۔ غلافی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور ہلکی سی شرارت کا عکس لڑکپن سے جوانی تک رہا۔ آخری عمر میں یہ چمک دمک گہرے غور وفکر میں ڈھل گئی تھی۔

پہلی ہی ملاقات میں اپنا بنا لینے والے سلیم احمد گفتگو کے ماہر تھے۔ اُن سے ملنے والے اُن کی مہارت گویائی کے معترف ہیں۔ یہ گفتگو اکثر اوقات مدلل اور پر جوش ہوتی تھی۔ سلیم احمد مخاطب کی بات توجہ سے سُنتے تھے۔ سلیم احمد کا یہ رویہ عمر بھر اُن کے ساتھ رہا۔ مخاطب کی بات غور سے سننے کے بعد جب وہ بولتے تو مخاطب کو لاجواب کر دیتے۔ بڑے اعتماد اور جچے تلے لفظوں کے ساتھ ہونے والی گفتگو سامعین کو دیر تک مسحور کیے رکھتی۔ سلیم احمد کا طرز استدلال کبھی کبھی ہٹ دھرمی میں بھی بدل جاتا تھا۔ جیسا کہ ڈاکٹر اسلم فرخی کا خیال ہے۔ "سلیم عام طور پر گفتگو میں سلیم الطبع تھے لیکن موقع محل کی مناسبت سے ضدی بھی ہو جاتے تھے۔" ۵۴

دورانِ گفتگو سلیم احمد اپنے بے تکلف دوستوں کے نام کے ساتھ ''خان'' کا اضافہ کر دیتے تھے مثلاً جمال پانی پتی آئے تو کہا" آؤ جمال خان" یہی انداز گفتگو محمد حسن عسکری کا بھی تھا۔

سلیم احمد کی مجلس گفتگو میں جہاں شائستگی اور مشرقی تہذیب کے آداب کا مکمل خیال رکھا جاتا وہاں وہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے اپنی گفتگو میں میرٹھ کے کبابوں والا چٹ پٹا مسالہ بھی ڈال دیتے۔ جہاں دلائل کی بات ہوتی وہاں چومکھی لڑتے۔ وہ گفتگو میں ہمیشہ جمع کا صیغہ استعمال کرتے تھے گویا مخاطب چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی پوری تکریم کرتے۔

سلیم احمد کی پیشانی کشادہ تھی، سر کے بال گھنے اور لمبے تھے۔ گفتگو کے دوران بالوں کی ایک لٹ اکثر ماتھے پر بھی آجاتی۔ وہ ہاتھوں کی کنگھی سے اس لٹ کو سلجھائے جاتے اور میرِ محفل بن کر مخاطب کی بات کا جواب دیئے جاتے۔ گفتگو میں حفظِ مراتب کا پوری طرح خیال رکھتے تھے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کہتے ہیں:

''موت کے فرشتے نے سلیم کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے ایک ایسے لمحے کا انتخاب کیا جب وہ محوِ خواب تھا۔ عالمِ بیداری میں اگر سلیم اپنے دل موہ لینے والے انداز میں گفتگو شروع کر دیتا تو شاید اس فرشتے کو اپنے کار منصبی کی انجام دہی میں وقت پیش آتی۔'' ۵۵

باطنی شخصیت

انسان کا باطن ایک اتھاہ سمندر ہے۔ بقول حضرت سلطان باہوؒ۔

''دِل دریا سمندروں ڈوہنگے کون دلاں دیاں جانے ہُو''

جہاں تک سلیم احمد کی باطنی شخصیت کا تعلق ہے، وہ ظاہری شخصیت سے بھی زیادہ من موہنی ہے۔ یُوں تو ہر ادیب اور شاعر دردمندی اور شدّت احساس کا خزانہ دار ہوتا ہے لیکن سلیم احمد حقیقتاً سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں سموئے ہوئے تھے۔ وہ کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ایک بے روزگار نوجوان سلیم احمد کے پاس آیا اور اپنی بے روزگاری اور تنگ دستی کا رونا رو کر مدد چاہی۔ سلیم احمد نے اُس نوجوان کو باپ جیسی شفقت دی لیکن وہ موقع پر سلیم احمد کی کتابیں اور نقدی لے اُڑا۔ تاہم ان میں احمد جاوید جیسے نوجوان بھی تھے جو سلیم احمد کے پاس برسوں رہے نہ صرف سلیم احمد کی صحبت سے فیض اُٹھایا بلکہ اپنے محسن کو یاد بھی رکھا۔ ساقؔی فاروقی کی طرح باغی بھی نکلے اور سارہ شگفتہ کی طرح احسان شناس بھی۔ سارؔہ نے لکھا ہے۔ "سلیم احمد نے مجھے اُس وقت سے بیٹی جانا جب میں لفظ لفظ بھی نہ تھی۔"۵۶

سلیم احمد ایک چھتنار درخت تھے۔ وہ عمر بھر خود تو دھوپ میں جلے لیکن دوسروں کو ٹھنڈی چھاؤں مہیا کرتے رہے۔ ایک سعادت مند بیٹے کی حیثیت سے انہوں نے نو برس کی عمر میں اپنی بیوہ ماں اور یتیم بہن بھائی کا ہاتھ تھاما اور بڑی محنت اور محبت کے ساتھ کشتی حیات کو کھیتے رہے۔

وہ ایک شفیق اور غمگسار بھائی تھے۔ شمیم احمد نے اپنے زیرِ طبع سوانحی ناول "بھائی صاحب" میں جگہ جگہ سلیم احمد کی شفقتوں اور محبتوں کے ترانے گائے ہیں۔ اِن دونوں بھائیوں کی محبت بے مثال تھی۔ سلیم احمد نہ صرف خود دنیائے ادب میں نامور ہوئے بلکہ اپنے بھائی کو بھی اپنے برابر لانے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے شمیم احمد کی پسند وناپسند اور جذبات کا ہمیشہ خیال رکھا اور انہیں اختلاف کرنا سکھایا اور اِس اختلاف کا اعتراف کیا۔ وہ شمیم احمد کو اپنے باپ سیّد شرافت کا عکس قرار دیتے تھے۔

ملی ہے چچا سے مجھے زہد سازی
انہیں باپ سے خوئے رنگیں مزاجی
یہ چھوٹے ہیں مجھ سے پہ مجھ سے بڑے ہیں
شرافت علی جیسے پیچھے کھڑے ہیں

ایک پیار کرنے والے شوہر کی حیثیت سے سلیم احمد نے اپنی بیوی کے حقوق بطریقِ احسن ادا کئے۔ وہ ایک شفیق باپ تھے وہ اپنے فرائض سے آگاہ تھے۔ انہیں اپنے بچوں کی ضرورتوں کا پورا پورا احساس تھا۔ بچوں کی تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی پوری توجہ دیتے تھے۔ اپنی بڑی بیٹی قرۃ العین (پ ۱۹۶۷ء) کے لئے جہاں کھلونے لاتے وہاں گھر پر اُس سے خُوب لاڈ پیار بھی کرتے۔ عینی کا ذکر سلیم احمد کی مختلف کتابوں میں بطور مثال یا حوالہ بھی آیا ہے۔ جب اُن کے آنگن میں یہ پہلی کلی کھلی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ سلیم احمد اپنے دوسرے بچوں کے ساتھ بھی یہی مشفقانہ سلوک کرتے تھے۔

جب ڈرائنگ روم میں دوستوں اور مہمانوں کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہوتے، اُن کے بچے بھی وہاں آجاتے۔ سلیم احمد انہیں گود میں اُٹھا لیتے اور پیار کرتے۔ بچے اپنے باپ کے کانوں میں "کُو کتے" تو اُن کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ سلیم احمد کی بڑائی اپنے بچوں کے ساتھ اُن کی سطح پر اُتر کر پیار کرنے بھی مضمر ہے۔ شاید ایسے ہی کسی موقع پر انہوں نے کہا تھا۔

آدمی بن کے برا آدمیوں میں رہنا
اک الگ وصف ہے، درویشی و سلطانی سے

سلیم احمد محبت کرنے والے شخص تھے۔ محبت کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹتے تھے۔ نہ شاعری میں اور نہ عملی زندگی میں۔ غمگساری اور دلداری کی بے پناہ دولت انہیں نصیب ہوئی تھی۔

سلیم احمد کی کُتب کا جائزہ

ابتدائیہ

سلیم احمد ایک تخلیقی شخصیت تھے۔ اُن کا تخلیقی سفر کم و بیش پنتالیس برسوں پر محیط ہے۔ اس سفر کے ابتدائی پانچ برسوں (۴۴۔۳۹ء) کو نومشقی کا زمانہ سمجھ لیا جائے، تب بھی وہ مسلسل چالیس سال تک لکھتے رہے۔ لکھنا اُن کے لئے وظیفہء حیات تھا۔ وہ اگر نہیں لکھتے تو زندگی سے اُکتا جاتے۔ جب وہ نہ لِکھ سکتے تو دوستوں کو اپنی اِس بے کاری کے بارے میں تشویش سے آگاہ کرتے۔ جُوں جُوں بیکاری کا یہ عرصہ طویل ہوتا جاتا، اُن کا اندرونی کرب بڑھتا جاتا تا آنکہ تخلیق یا تنقید کا کوئی چشمہ اُبلنے لگتا۔ واضح رہے کہ یہاں بیکاری سے مراد کسی تخلیقی کام (CREATIVE ACTIVITY) کا نہ ہونا ہے۔ ورنہ کمرشل تحریریں تو وہ روز لکھتے ہی رہتے تھے۔

سلیم احمد کی تخلیق کا اوّلین شعبہ، شروع میں شاعری تھا۔ اگر چہ میرٹھ کالج کے زمانہء طالب علمی میں اُن کی فکشن سے بھی دلچسپی رہی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بیان کے مطابق دونوں دوست مل کر ہر روز ایک افسانہ لکھتے لیکن فکشن سے یہ دلچسپی اُن کی تخلیقی شخصیت کا غالب جزو نہ بن سکی۔ اُن کی زیادہ تر دلچسپی شاعری ہی سے رہی۔

۵۰ء کی دہائی میں سلیم احمد تنقید میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ "ادبی اقدار" کے عنوان سے اُن کا پہلا تنقیدی مجموعہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اُن کی دوسری کتاب "نئی نظم اور پورا آدمی" بھی تنقیدی مضامین پر مشتمل تھی جو ۱۹۶۲ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ ۶۰ء کی دہائی میں بھی اُن کا غالب رجحان تنقید کی طرف رہا۔ اگر چہ اُن کی دو اور کتابیں "غالب کون؟" (۷۱ء) اور "ادھوری

جدیدیت "(۷۷ء) دیر سے شائع ہو سکیں لیکن ان کتابوں میں شامل مضامین ۶۰ء کی دہائی ہی میں لکھے گئے۔ اس دہائی میں سلیم احمد کا پہلا شعری مجموعہ "بیاض" (۱۹۶۶ء) بھی سامنے آیا۔

۷۰ء کی دہائی میں "اقبال۔ ایک شاعر" اور "محمد حسن عسکری، آدمی یا انسان" لکھیں۔ یہ بھی تنقیدی کتب ہیں۔ اسی دہائی میں تنقیدی مضامین کا ایک اور مجموعہ "اکائی" اگرچہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا لیکن اس میں پہلے مجموعہ کلام "بیاض" کی اشاعت (۱۹۶۶ء) کے بعد سولہ سال تک کا کلام شامل ہے۔ ۴۵ء سے ۸۰ء تک پچیس برسوں کا جائزہ لیا جائے تو اس دوران میں سلیم احمد کے تنقیدی مضامین کے چھ مجموعے شائع ہوئے جبکہ شاعری کی صرف دو کتابیں منظرِ عام پر آسکیں۔ سلیم احمد کا تیسرا شعری مجموعہ "چراغِ نیم شب" اُن کی وفات کے بعد ۱۹۸۵ء میں چھپ سکا۔ شاعری کی ایک کتاب "مشرق" کی تشہیر کئی برس تک ہوتی رہی مگر یہ بھی مرحوم کی وفات کے چھ سال بعد ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔

اخباری کالموں کا ایک انتخاب بعنوان "اسلامی نظام، مسائل اور تجزیئے" بھی سلیم احمد کی وفات کے بعد ۱۹۸۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔

ڈراما، سلیم احمد کی تخلیقی شخصیت کا ایک توانا روپ تھا لیکن اُن کے ڈراموں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ البتہ شاعری کی کلیات ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کر کے ۲۰۰۳ء میں شائع کی ہے۔ جس میں "بازیافت" کے عنوان سے سلیم احمد کے نثریے بھی شامل ہیں۔

اِس طرح اب تک (۲۰۰۸ء) سلیم احمد کی کل تیرہ (۱۳) کتب شائع ہوئی ہیں۔ آٹھ اُن کی زندگی میں اور پانچ وفات کے بعد۔ اِن میں سے دو کتابیں "اکائی" اور "اقبال۔ ایک شاعر" دوسری بار چھپی ہیں۔ اگر کوشش اور وسائل یکجا ہوں تو سلیم احمد کے منتخب اخباری کالموں کے دو تین مجموعے با آسانی مرتب اور شائع ہو سکتے ہیں۔ اس طرح مختلف لائبریریوں اور اخبارات و رسائل میں بکھرے ہوئے مسودات کی مدد سے ڈراموں کے ایک دو مجموعے بھی چھپ سکتے ہیں۔ انہوں نے کم و بیش تیس برس تک ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لئے بے شمار ڈرامے لکھے۔

سلیم احمد نے ہمعصروں کو خطوط اگرچہ کم لکھے لیکن اُن کے کچھ خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ان کی روشنی میں سلیم احمد کی شخصیت اور فن کے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔

اگر سلیم احمد کی عمر وفا کرتی تو وہ "بابائے جدیدیت" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔اسلام اور مسلمانانِ برِصغیر کے حوالے سے بھی ایک بڑا علمی منصوبہ اُن کے پیشِ نظر تھا۔اس کے لئے انہوں نے اپنے کالموں، مطبوعہ روزنامہ حریت کراچی (اگست ۸۳ء) میں فنڈز جمع کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔اسی طرح میر تقی میرؔ، علامہ اقبال، ابنِ عربی اور ڈی ایچ الارنس کے حوالے سے بھی مختلف کتب کا مواد اُن کے پاس تیار تھا۔انہیں اس قدر مہلت بھی نہ مل سکی کہ وہ ان مجوزہ کتب کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر سکتے۔ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

سلیم احمد اپنی تنقیدی کُتب لکھنے میں زیادہ وقت نہیں لیتے تھے۔متفرق مضامین سے ہٹ کر مستقل موضوعات مثلاً اقبال یا غالب پر انہوں نے جو کتابیں لکھیں وہ دو ہفتے کے عرصے ہی میں لکھیں۔

سلیم احمد کی کتابوں کی ترتیب زمانی کے لحاظ سے اشاعت اور دیگر تفصیلات پیش ہیں۔

۱۔ادبی اقدار

سلیم احمد نے آغاز تو شاعری سے کیا لیکن اُن کی پہلی کتاب "ادبی اقدار" تنقیدی مضامین پر مشتمل تھی۔یہ ۱۹۵۶ء میں منظرِ عام پر آئی۔اسے "حلقہ اربابِ فکر تین ہٹی۔کراچی" نے شائع کیا۔مصنف کے بقول اس کتاب کے محرک اختر انصاری اکبر آبادی تھے۔اس کے سول ایجنٹ "مرکزِ ادب مشن روڈ۔کراچی" کے احباب تھے۔"نذیر پرنٹنگ پریس۔کراچی" نے اسے چھاپا۔

چھوٹی تقطیع کے ۱۰۸ صفحات کی اس کتاب کی قیمت (تقریباً ۱ روپے ۶۰ پیسے) رکھی گئی۔تعدادِ اشاعت معلوم نہیں ہو سکی۔تا حال اِس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔مصنف کی یہ کتاب مارکیٹ میں دستیاب نہیں۔اس نایاب کتاب کو اگر از سرِ نو شائع کیا جائے تو اپنے مندرجات کی وجہ سے اب بھی ذوق و شوق سے پڑھی جا سکتی ہے۔

"ادبی موت" کے عنوان سے مصنف نے دو صفحات کا ایک مختصر سا دیباچہ لکھا ہے۔اس کے

علاوہ چار طویل مضامین ہیں۔ دیباچہ میں سلیم احمد نے لکھا ہے۔ "اس مختصر سے مجموعے سے آپ میری ذہنی ترقی یا انحطاط کا حال آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ اگر ترقی نظر آئے تو یقین کر لیجئے کہ ریڈیو پاکستان کی ملازمت ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے اور انحطاط نظر آئے تو مجھے کوسیئے کہ میں نے روٹی کے معاوضہ پر اپنی روح بیچ دی ہے۔"

چار طویل تنقیدی مضامین درج ذیل ہیں۔

۱۔ اکبر اور اُن کا زاویہ نظر۔ صحیح سنہ تحریر نامعلوم لیکن اندازہ ہے کہ یہ ۵۵۔۵۰ء کے درمیان لکھا گیا۔

۲۔ زندگی ادب میں۔ ۴۸ء میں لکھا گیا۔ مصنف کا پہلا تنقیدی مضمون ہے۔ اُردو مرکز کراچی میں پڑھا گیا۔

۳۔ ادبی اقدار ۔ ۴۸ء میں لکھا گیا۔

۴۔ اُردو غزل ۔ ۵۶ء میں تحریر گیا۔

اہلِ ذوق اس کے منتظر تھے کیونکہ مختلف طریقوں سے اس کی مناسب تشہیر ہو چکی تھی۔ ادبی محفلوں میں سلیم احمد ایک نوآموز لیکن جارح نقاد کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے۔

۲۔ نئی نظم اور پُورا آدمی

سلیم احمد کے مختلف تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ "نئی نظم اور پورا آدمی" کے نام سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ "ادبی اکیڈمی۔ ۱۸۸۷۔ پی آئی بی کالونی۔ مارٹن روڈ۔ کراچی" نے "جاوید پریس" سے چھپوا کر تقسیم کیا۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۲۷ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت تین روپے پچاس پیسے رکھی گئی۔ اشاعت اوّل کا انتساب درج ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"ثناء اللہ (مدیر نیا دور) کے نام جس نے یہ مضامین مجھ سے زبردستی لکھوائے اور پھر یہ کہہ کر بری الذمہ ہو گیا کہ مضمون نگار کے خیالات سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔"

اشاعت ثانی میں یہ انتساب بوجوہ حذف کر دیا گیا۔ اشاعت اوّل اور اشاعت ثانی میں

مضامین کی ترتیب درج ذیل ہے۔

اشاعت اوّل

کُل چار مضامین ہیں۔

۱۔ نئی نظم اور پورا آدمی
۲۔ غزل مفلر اور ہندوستان
۳۔ غالب اور نیا آدمی
۴۔ عشق اور قحطِ دمشق

اشاعت ثانی

کُل ۱۲ مضامین ہیں۔

۱۔ نئی نظم اور پورا آدمی
۲۔ کسری آدمی کا سفر
۳۔ تثلیث کا تیسرا پایہ
۴۔ نیا عہد نامہ۔ باب پیدائش
۵۔ نیا آدمی اور پُرانا آدمی
۶۔ غالبؔ اور نیا آدمی
۷۔ حالیؔ سے لامساوی انسان تک
۸۔ عشق اور قحطِ دمشق
۹۔ انسانی رشتے اور غالبؔ
۱۰۔ مرزا یگانہؔ کی شاعری
۱۱۔ غزل مفلر اور ہندوستان
۱۲۔ اسلامی زندگی مع چھ رنگین ناچوں

کے شروع میں دو صفحے کا "ابتدائیہ" ہے جس میں مصنف نے بتایا کہ اُس نے ان مضامین میں گزشتہ ایک صدی کے ادب کا نئے زاویے سے جائزہ لیا ہے۔

سلیم احمد کی وفات کے چھ سال بعد "نفیس اکیڈمی کراچی" نے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ یہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہے۔ آفسٹ چھپائی کے ساتھ ساٹھ روپے قیمت رکھی گئی کُل صفحات ۲۲۸ ہیں۔ درمیانی تقطیع ہے۔ خیال انگیز سرورق اور مضبوط جلد ہے۔ تعداد اشاعت نا معلوم جملہ حقوق مصنف کے قانونی ورثا کے نام محفوظ ہیں۔

نئے ایڈیشن کے شروع میں "عرضِ ناشر" کے عنوان سے طارق اقبال گاہندری نے سلیم احمد کی زیرِ نظر کتاب کے علاوہ ایک دوسری تنقیدی کتاب "نئی شاعری، نامقبول شاعری" کی اشاعت پر

اپنے اعزاز کا اظہار کیا ہے۔ شمیم احمد نے بھی " کچھ اس کتاب کے بارے میں " کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مرحوم بھائی کی طرف سے عائد شدہ ایک قرض (کتابوں کی اشاعت کی صورت میں) اُتارنے پر شکر ادا کیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ بھائی صاحب اپنی وفات سے قبل جن سات کتب کی اشاعت کا منصوبہ بنا رہے تھے اب وہ سب کی سب چھپ چکی ہیں۔

"نئی نظم اور پورا آدمی" کے دوسرے ایڈیشن کے لئے سلیم احمد نے اپنی زندگی ہی میں کئی مضامین کا اضافہ کر دیا تھا۔ مرتبین (شمیم احمد، جمال پانی پتی) نے نئے ایڈیشن میں بعض ایسی تحریریں بھی شامل کر دی ہیں جو سلیم احمد کے منصوبے میں تو شامل نہ تھیں لیکن ان کا کتاب کے بنیادی موضوع کے ساتھ گہرا تعلق بنتا ہے۔ مرتبین کے بقول

"ہم نے اس میں کچھ ایسی تحریروں کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی ہے جن کا موضوع پورے آدمی کا تصور یا تہذیبی اکائی تھا۔ لیکن ہم نے اس میں فی الوقت "نئی نظم اور پورا آدمی" کے پہلے ایڈیشن والے باقی ماندہ وہ دو مضامین بھی اسی طرح رہنے دیے ہیں جو بظاہر اس موضوع سے متعلق نہیں۔ "یہ دو مضامین "عشق اور قحطِ عشق" اور "غزل مظفر اور ہندوستان" ہیں۔

پہلا مضمون شروع ہونے سے پہلے "پورا آدمی" کے عنوان سے چھ بندوں پر مشتمل ایک نظم ہے۔ جس کا مرکزی خیال مولانا رومؒ کے اس مصرع سے ماخوذ ہے۔ ع

کز داد و دو ملولم و انسانم آرزوست

مصنف کا کہنا ہے کہ اُس نے یہ مضامین بہت اضطراب کی حالت میں حالت میں لکھے ہیں اور وہ پڑھنے والوں سے اسی داد کا طالب ہے کہ وہ مصنف کی تکلیف اور بے تابی کا اندازہ کر لیں۔

۳۔ بیاض

یہ سلیم احمد کی تیسری کتاب ہے مگر شاعری کے لحاظ سے یہ اُن کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا اور اب تک دوبارہ شائع نہیں ہو سکا۔ اسے "دھنک پبلشرز ۳۸۔ دلکشا چیمبرز مارسٹن روڈ۔ کراچی" نے

"سپر آرٹ پریس۔ کراچی" سے چھپوا کر شائع کیا۔ جملہ حقوق مصنف کے نام محفوظ ہیں۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس مجموعہ غزلیات کی قیمت تین روپے پچاس پیسے رکھی گئی۔ یہ مصنف کی پہلی کتاب ہے جس کی تعدادِ اشاعت ایک ہزار ہے اور یہ تعداد کتاب پر درج بھی ہے۔

"بیاض" کا انتساب مصنف نے اپنے استاد محمد حسن عسکری کے نام کیا ہے۔ سلیم احمد کے بقول اس مجموعے میں موجود غزلوں کے محرّک بھی محمد حسن عسکری ہیں۔

"گزارش" کے عنوان سے سلیم احمد نے وضاحت کی ہے۔

"گزارش ہے کہ میں نے یہ کتاب ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لئے نہیں لکھی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے والے سے میں جسمانی ہی نہیں نفسیاتی بلوغت کا مطالبہ بھی کرتا ہوں۔"

۴۔ غالب کون؟

۱۹۶۹ء میں عالمی سطح پر "غالبؔ صدی" منائی گئی۔ اس موقع پر غالبیات میں معتد بہ اضافے ہوئے۔ سلیم احمد نے "غالب کون؟" بھی اسی حوالے سے لکھی۔

اس کتاب کو سلیم احمد کے قائم کردہ ادارے "مطبوعات المشرق۔ کراچی" نے "انجمن پریس۔ کراچی" سے ۱۹۷۱ء میں چھپوایا۔ تعداد اشاعت ایک ہزار۔ چھوٹی تقطیع۔ صفحات ۱۵۹، قیمت سات روپے پچاس پیسے۔ کتاب کا انتساب خدائے سخن میر تقی میر کے نام کیا گیا ہے۔ سلیم احمد کے الفاظ میں ہیں۔

"خدائے سخن میر تقی میرؔ کے نام۔ جن کے بارے غالب کو طوعاً و کرہاً ناسخ کا ہمنوا ہو کر اعتراف کرنا پڑا۔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں۔"

سلیم احمد کی دیگر تنقیدی کتب کی طرح "غالب کون؟" بھی بہت سے نزاعات کا موجب بنی۔ "بسم اللہ" کے عنوان سے سلیم احمد نے دیباچے میں لکھا۔

"ایسی صورت میں جبکہ غالبؔ کی شہرت برصغیر کے گلی کوچوں سے نکل کر یورپ اور امریکہ کے بازاروں اور چین اور روس کے مکینوں تک پہنچ چکی ہے۔۔۔۔ محمد حسن عسکری کہ اُردو کے پروفیسروں سے بہت چڑتے ہیں اور آج کل مغرب کے

ادیبوں سے بھی تپے ہوئے ہیں، انہوں نے ہر کس و ناکس یہاں تک کہ رسّل کو بھی غالبؔ پر بولتے سُنا تو ایک بار پھر پوچھ لیا۔ غالب کون؟"

"غالبؔ کون؟" کے مضامین کی فہرست کچھ یُوں ہے۔

شاعری اور شخصیت، شخصیت مثبت اور منفی، شخصیت انا اور اصول حقیقت نمبر ۱، نمبر ۲، شخصیت انا اور شعور، شخصیت اور اسلوب، شخصیت اور فریضہ، قربانی، غالب نام آورم، آشوب آگہی، مسائلِ تصوف، آئینہ زدودن، خندہ ہائے بیجا، انداز بیاں اور، عندلیب گلشن نا آفریدہ، فرزندِ آذر۔

اس سے پہلے سلیم احمد کی کتابیں متفرق مضامین پر مشتمل تھیں۔ یہ پہلی کتاب ہے جو ایک مستقل موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ دوبارہ شائع نہیں ہو سکی۔

۵۔ اُدھوری جدیدیت

متفرق تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ "ادھوری جدیدیت" کے عنوان سے ۱۹۷۷ء میں پہلی بار چھپا۔ اسے "سفینہ اکیڈمی۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی" نے "ایجوکیشنل پریس۔ کراچی" سے طبع کرا کے شائع کیا۔ یہ چھوٹی تقطیع کے کُل ۲۰۸ صفحات ہیں۔ قیمت۔ ۱۵/ روپے

انتساب اپنے محترم اُستاد پروفیسر کرّار حسین کے نام کیا ہے۔ سلیم احمد نے اعتراف کیا ہے کہ پروفیسر موصوف کے ساتھ ذہنی اور جذباتی تعلق کے بغیر اُس کی زندگی وہ نہ ہوتی، جو ہے۔

علامہ راغبؔ مرادآبادی نے "ادھوری جدیدیت" کا قطعہ تاریخ کہا جو درج ذیل ہے۔

نگارِ غم در آغوش ہیں سلیم احمد
عطا بدستِ مشیت ہوئی ہے دولت فن
بچشمِ اہلِ نظر، ایک جادۂ نو ہے
یہ سحر کاری، دانش، یہ سعی مستحسن
روش روش پہ ہے سلمائے آگہی رقصاں
کھلا ہوا ہے مضامینِ نو کا اک گلشن

کتاب کے مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔ ادھوری جدیدیت، جدید غزل، غالبؔ کی انانیت، ضرب

کلیم شاعری یا فلسفہ؟، آزادی رائے کو بھونکنے دو، بڑے شہر کا شاعر، آیاتِ جمال، "میرے خیال میں" پر چند خیالات، ادب اور شعور، جوش اور خُدا، جوش اور جوش، جوش اور آدمی، جوش اور عشق، جوش اور فن۔

آغاز میں مصنف نے "ادھوری بات" کے عنوان سے مذکورہ بالا مضامین کا پس منظر بیان کیا ہے۔ اگر ان مضامین کے سنہ تحریر کے حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو سلیم احمد کے ذہنی سفر کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

۶۔ اقبال۔ ایک شاعر

جس طرح غالب صدی پر غالبیات کا وافر ذخیرہ جمع ہوا اسی طرح ۷۷ء میں قومی سطح پر پاکستان میں اقبالیات کے ضمن میں بھی معتدبہ اضافے ہوئے۔ سرکاری ادارہ "اقبال اکادمی پاکستان" نے بعض نامور اہلِ قلم سے اقبالیات کے مختلف گوشوں پر کتابیں لکھوائیں۔ سلیم احمد نے بھی ڈاکٹر محمد اجمل کی سفارش پر "اقبال۔ ایک شاعر" لکھی مگر اکادمی نے یہ کتاب بوجوہ شائع نہ کی۔

اکادمی کے دفتری مراحل سے گزرتے ہوئے اس کتاب کی اشاعت میں کافی تاخیر ہوگئی چنانچہ یہ کتاب اُس وقت (۱۹۷۹ء میں) منظرِ عام پر آئی جب "اقبالیات" کی رو آگے گزر چکی تھی۔ تاہم جب تک "اقبالیات" کا موضوع زندہ رہے گا، "اقبال۔ ایک شاعر" کا ذکر بھی ہوتا رہے گا۔

اس کتاب کو صلاح الدین محمود نے "نقشِ اوّل کتاب گھر لاہور" کی طرف سے شائع کیا۔ یہ سلیم احمد کی پہلی کتاب ہے جو کراچی کے علاوہ کسی دوسرے شہر سے شائع ہوئی۔ درمیانی تقطیع کے ۱۱۸ صفحات کی قیمت درج نہیں تعدادِ اشاعت بھی نہیں لکھی گئی۔ "جملہ حقوق محفوظ" ہیں مگر یہ وضاحت نہیں کہ کس کے نام؟

"اقبال۔ ایک شاعر" کا دوسرا ایڈیشن "قوسین۔ لاہور" نے شائع کیا۔ ۱۹۸۷ء میں چھپنے والا یہ ایڈیشن پہلے سے زیادہ خوبصورت ہے۔ سرورق بامعنی ہے اور جلد مضبوط۔ مصنف کی توضیحات کی وجہ سے ضخامت بڑھ کر ۱۶۰ صفحات ہوگئی ہے۔ قیمت-/۶۰ روپے۔ تعدادِ اشاعت درج نہیں۔

کتاب کا انتساب دونوں اشاعتوں میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام درج ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام ـــــــ محبت گلشنِ جاں را بہار است"

"اقبال۔ ایک شاعر" کا پیش لفظ پروفیسر کرّار حسین نے لکھا۔ انہوں نے سلیم احمد کی کاوشوں کی داد دیتے

کے علاوہ جہاں تہاں اُن سے اختلاف بھی کیا ہے۔ کتاب کے مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔

ایک سچے شاعر کا المیہ، اقبال اور اُردو شاعری کی چار قسمیں، اقبال کی ایک داخلی تصویر، اقبال کا جہاد، قبال اور صدائے کُن فیکون، اقبال کا سورۂ اخلاص، موچی دروازے کی شاعری، اقبال کا معجزۂ فن، اقبال کا ایک شعری کردار ابلیس، اقبال کا ایک شعری کردار، شاہین۔

کتاب کے شروع میں مصنف نے "اقبال، اقبالیات اور ہم" کے عنوان سے لکھا ہے کہ اقبال کے بارے میں ہماری تنقید دل میں چور رکھ کر بات کرنے کی عادی ہو چکی ہے۔

"غالب کون؟" کے بعد کسی مستقل موضوع پر سلیم احمد کی یہ دوسری کتاب ہے۔ "غالب کون؟" کی طرح اس کتاب کو بھی ذہن سے کاغذ پر منتقل کرنے میں سلیم احمد نے چودہ پندرہ دن صرف کئے۔ اس کتاب کے حوالے سے بھی کئی مباحث نے جنم لیا۔

۷۔ اکائی

یہ سلیم احمد کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو قطعات، نظموں، ثلاثی اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ ۸۲ء منظر عام پر آیا۔

فلیپ پر احمد ندیم قاسمی کی رائے درج ہے جنہوں نے سلیم احمد کے نظریاتِ شعروفن سے ہزار اختلاف رکھنے کے باوجود دو مقامات پر متفق ہونے کی بات کی ہے۔ ایک اطہر نفیس سے محبت اور دوسرا سلیم احمد کی شاعری سے محبت۔

یہ کتاب "نقوش پریس لاہور" سے شائع ہوئی۔ اس طرح لاہور سے شائع ہونے والی یہ اُن کی دوسری کتاب ہے۔

سلیم احمد "اکائی" کا دوسرا ایڈیشن چھپوانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے "تنظیم احباب میرٹھ کراچی" سے معاملات طے پا چکے تھے کہ موت کا بلاوا آ گیا۔ "اکائی" کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ۱۹۸۵ء میں سلیم احمد کی وفات کے بعد شائع کیا گیا۔

"اکائی" کا انتساب دونوں اشاعتوں میں "طاہرہ بیٹی کے نام" ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے نظر ثانی

شدہ ایڈیشن میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون "وہ دن جو بیت گئے زندگی کا حاصل تھے" بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ عزیز حامد مدنی نے ایک مضمون لکھا ہے۔ "شیروانی کے بٹن سے خاکِ لالہ وگل تک" یہ دونوں مضامین سلیم احمد کی شخصیت اور شاعری کی تفہیم میں مدد دیتے ہیں۔

پہلے فلیپ پر ڈاکٹر جمیل جالبی کے مضمون سے ماخوذ رائے درج ہے جبکہ دوسرے فلیپ پر شاعر کی مطبوعہ، غیر مطبوعہ اور زیرِ طبع کتب کی فہرست درج کی گئی ہے۔اس اشاعت کا سرورق زیادہ با معنی اور جاذبِ نظر ہے۔بیک ٹائیٹل پر سلیم احمد کی پاسپورٹ سائز تصویر اور مختصر سوانحی خاکہ تحریر کیا گیا ہے۔چونکہ یہ ایڈیشن سلیم احمد کی وفات کے بعد شائع ہوا اس لئے مرحوم کی تاریخ وفات بھی لکھ دی گئی ہے۔

لاہور اور کراچی سے شائع ہونے والے دونوں ایڈیشنوں کا سائز ایک جیسا ہے البتہ کراچی ایڈیشن ہر لحاظ سے بہتر ہے۔اس کی تعداد اشاعت ایک ہزار ہے، قیمت درج نہیں ہے۔لاہوری ایڈیشن ۱۹۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

کتابی صورت میں چھپنے سے قبل "اکائی" کی بیشتر نظمیں، قطعات اور غزلیں، اخبارات و جرائد میں چھپ چکی تھیں کیونکہ یہ شعری مجموعہ پہلے مجموعہ (بیاض) کی اشاعت کے سولہ سال بعد منظر عام پر آیا۔

۸۔ محمد حسن عسکری ۔ آدمی یا انسان

۱۹۷۱ء کے بعد سلیم احمد کی زندگی میں سات آٹھ برس کی خاموشی کا ایک زمانہ بھی آتا ہے۔ خاموشی کا یہ قفل ٹوٹا تو "محمد حسن عسکری، آدمی یا انسان" کی صورت میں سلیم احمد کی ایک اور تنقیدی کتاب منظرِ عام پر آئی۔ یہ ۷۸ء میں لکھی گئی اور چھپتے چھپتے ۸۶ء میں کہیں جا کر چھپی۔اسے مشفق خواجہ نے "مکتبہ اسلوب ناظم آباد، کراچی" کی طرف سے شائع کیا۔

۹۶ صفحات پر مبنی اس کتاب کی قیمت ۱۵/- روپے رکھی گئی۔ کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے یہ تمام مضامین "تخلیقی ادب" میں چھپ چکے تھے۔ تعدادِ اشاعت ایک ہزار تھی۔ دوسرا ایڈیشن تا حال نہیں چھپ سکا۔

"محمد حسن عسکری، آدمی یا انسان" کا انتساب سلیم احمد نے اپنے بہنوئی عزیز ہاشمی کے نام کیا

ہے۔دیباچہ نظیر صدیقی نے لکھا ہے۔ انہوں نے پہلے تو اُردو تنقید کی کم مایگی پر اظہار افسوس کیا ہے اور پھر محمد حسن عسکری کی شخصیت اور فن پر سلیم احمد کے لکھے ہوئے مضمون کی اس طرح تلخیص کر دی ہے کہ بقول سلیم احمد۔ "اب کتاب پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔"

بیک ٹائیٹل پر مظفر علی سیّد کی رائے درج ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے۔ "یہ کتاب ہمارے دور کی ایک بہت بڑی شخصیت کا احاطہ کرتی ہے اور چند ایک قوسوں اور قطعوں کو چھوڑ کر ایک آدھا پونا سا دائرہ بنانے میں ضرور کامیاب ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مصنف نے مرکزِ صحیح کے تعین میں کوئی غلطی نہیں کی۔ اب اور کوئی چاہے تو اِس دائرے کو مکمل کر سکتا ہے مگر سلیم احمد کی اوّلیت برقرار رہے گی۔ کتاب کے کُل گیارہ ابواب ہیں۔ آخر میں دو ضمیمے بھی شامل کیے گئے ہیں۔

۹۔اسلامی نظام ۔ مسائل اور تجزیے

سلیم احمد کی وفات کے بعد شائع ہونے والی یہ پہلی کتاب ہے۔ جو دراصل مرحوم کے اہم اخباری کالموں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ اِسے "سلیم احمد ٹرسٹ" نے ۱۹۸۴ء میں شائع کیا۔ تعدادِ اشاعت دو ہزار تھی۔ اس حوالے سے یہ سلیم احمد کی سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتاب ہے۔

"اِسلامی نظام، مسائل اور تجزیے" کا انتساب اُس وقت روزنامہ جسارت کراچی کے سابق مدیر، محمد صلاح الدین کے نام ہے۔ وہ "سلیم احمد ٹرسٹ" کے خازن تھے اور اس حوالے سے بہت متحرک رہے۔ کتاب کے جملہ حقوق "سلیم احمد ٹرسٹ" کے نام محفوظ ہیں۔ یہ بڑی تقطیع کے ۲۶۲ صفحات ہیں سرورق معروف آرٹسٹ اسلم کمال نے بنایا ہے۔ اس کی قیمت-/۱۵ روپے ہے۔

اطہر زیدی کے تعارف نامے سے قبل سلیم احمد کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر بھی شائع کی گئی ہے۔ جس میں وہ محوِ گفتگو نظر آتے ہیں۔ یہ تصویر آخری دنوں میں لی گئی تھی۔ تصویر کی دوسری جانب سلیم احمد کا مشہور شعر درج ہے۔

شاید کوئی بندۂ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں

کُل ۲۹ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے تمام مندرجات سلیم احمد اپنی زندگی ہی میں ترتیب دے چکے تھے۔ چند اہم موضوعات درج ذیل ہیں۔

دین اور نظام ،اسلامی نظام اور اس کا نفاذ ،جرم و سزا کا مسئلہ
اصلاح معاشرہ ،اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ ،اسلام اور دنیاوی کامیابی
اصولِ اتحاد ،ہم اور ہمارے ذرائع ابلاغ ،پاکستان میں کردار کا بحران
قومی تشخص کا مسئلہ ،مغربی تہذیب کا مسئلہ ،ذہنی غلامی سے نجات کا مسئلہ
ادب اور ثقافت ،نظریاتی مملکت میں ادیب کا کردار، کچھ نظامِ تعلیم کے بارے میں

۱۰۔چراغ نیم شب

"چراغِ نیم شب" سلیم احمد کی اُن ۵۱ غزلوں کا مجموعہ ہے جو۸۲ء سے اگست ۸۳ء کے مختصر عرصے میں کہی گئیں۔ اسے " مکتبہ اسلوب۔ کراچی" نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔ اس ادارے کی طرف سے شائع کی جانے والی یہ سلیم احمد کی دوسری کتاب ہے۔ سرورق جاذب نظر اور سلیم احمد کے افکار خصوصاً چراغ نیم شب کے مفاہیم کا عکاس ہے۔ کتابت عمدہ اور جلد مضبوط ہے۔ ۱۱۹ صفحات پر پھیلے ہوئے اِس شعری مجموعے کی قیمت -/۳۰ روپے ہے۔ جملہ حقوق مرحوم کی بیوہ نور جہاں سلیم کے نام محفوظ ہیں۔ انتساب کے الفاظ درج ذیل ہیں۔ "اطہر نفیس کے نام۔۔۔۔جو میرے لئے ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

"چراغِ نیم شب" کا ذکر اُس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ اس کے دیباچے کی بات نہ ہو۔ یہ دیباچہ سلیم احمد کے نوجوان دوست سراج مُنیر نے لکھا ہے اور بڑی محنت اور محبت سے لکھا ہے۔ سلیم احمد کی شاعری، تنقید اور فکر پر یہ ایک اہم مضمون ہے۔ درمیانی تقطیع کے ۲۴ صفحات پر پھیلے ہوئے اس مضمون میں بہت کچھ کہنے کے باوجود سراج مُنیر نے اعتراف عجز کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"سلیم احمد کے بارے میں کچھ لکھنا مشکل یُوں بھی ہوتا ہے کہ حقیقت نگاری بھی

مبالغہ آمیزی معلوم ہوتی ہے۔"

پہلے فلیپ پر شمیم احمد نے سلیم احمد کی شاعری کا مختصر پس منظر بیان کرنے کے بعد "چراغِ نیم شب" کی غزلیات کے حوالے سے لکھا ہے۔

"چراغِ نیم شب" کی غزلیات میں میرے خیال کی حد تک انہوں نے اُس آواز کو پا لیا تھا جس کے لئے اُنہوں نے ایک طویل مسافت اختیار کی تھی۔"

دوسرے فلیپ پر سلیم احمد کا مختصر سوانحی خاکہ دس مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ کتب کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ بیک ٹائیٹل پر سلیم احمد کے صرف چہرے کی تصویر ہے۔ پورے صفحے میں سے جھانکتی ہوئی یہ تصویر مرحوم کے آخری دنوں کی یادگار ہے۔

۱۱۔نئی شاعری ، نا مقبول شاعری

یہ اب تک شائع ہونے والی سلیم احمد کی آخری تنقیدی کتاب ہے جو اُن کے (۱۸) اٹھارہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے زیادہ تر مضامین ۷۰ء اور ۸۰ء کی دہائیوں میں لکھے گئے۔

یہ کتاب "نفیس اکیڈمی ۔ کراچی" نے ۱۹۸۹ء کے آخر میں شائع کی ۔ اس کے ساتھ اس ادارے نے سلیم احمد کی کتاب "نئی نظم اور پورا آدمی" کا دوسرا ایڈیشن بھی ۱۹۸۹ء ہی میں شائع کیا۔ دونوں کتب میں "عرضِ ناشر" اور " کچھ اس کتاب کے بارے میں "(از شمیم احمد) کے عنوانات سے تحریریں شامل ہیں ۔ جن میں ناشر نے کتب کی اشاعت پر اپنے اعزاز کا اظہار کیا ہے جبکہ شمیم احمد نے کتابوں کی اشاعت کا پس منظر واضح کیا ہے۔

اِس کتاب کو "احمد پرنٹرز ، ناظم آباد ۔ کراچی" نے طبع کیا ہے ۔ درمیانی تقطیع کے کُل ۲۲۸ صفحات ہیں جن کی قیمت -/۲۰۱ روپے ہے۔ سرورق جاذب نظر اور بامعنی ہے جملہ حقوق مصنف کے قانونی ورثاء کے نام محفوظ رکھے گئے ہیں۔

"نئی شاعری، نامقبول شاعری" کی ترتیب اور طباعت و اشاعت میں شمیم احمد اور جمال پانی پتی کی مساعی کا بہت حصہ ہے۔ اس کے ناشر اور طابع وہی ہیں جو "نئی نظم اور پورا آدمی "اشاعت

ثانی کے ہیں۔ مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔

روایت اور الہام، ارادہ اور شاعری؛ طرحی مشاعرے کی بات،

ابہام کیوں؟، ابہام اور بازی گری، اِبلاغ کا مسئلہ،

فکر کا طاعون، اردو شاعری میں جور و جفا کی روایت، روحِ انکار شیطان

تہذیب کا جن، میکانکی دماغ کی مجبوریاں، نئی شاعری، نامقبول شاعری،

گڈ بائی ٹو سرسیّد، اقبال، ہند اور اسلامی تہذیب، ایک ذاتی مسئلہ،

الف میں اور شام کا وعدہ، حکاتِ یوسف اور ہم، ارضی تہذیب کا انجام

اِن میں سے کلیدی اہمیت "نئی شاعری، نامقبول شاعری" کو حاصل ہے جس میں سلیم احمد ایک مختلف اسلوب سے سامنے آئے ہیں۔

۱۲۔ مشرق

"مشرق" سلیم احمد کی اب تک (۱۹۹۱ء) شائع ہونے والی آخری کتاب ہے۔ مصنف کے بقول یہ دراصل ایک طویل نظم ہے جو مزید کئی ذیلی نظموں کا مجموعہ ہے۔ "مشرق" اس لحاظ سے بھی قابلِ ذکر تصنیف ہے کہ بیرون ملک شائع ہونے والی یہ سلیم احمد کی پہلی کتاب ہے۔ اسے افتخار عارف نے "اُردو مرکز لندن" سے شائع کیا ہے جبکہ طباعت "فضلی سنز لمیٹڈ کراچی" ہی میں ہوئی ہے۔ پاکستان میں "مکتبہ نیا ادب، نیا اردو بازار کراچی" کو اِس کتاب کا سٹاکسٹ اور ڈسٹری بیوٹر مقرر کیا گیا۔

"مشرق" پہلی بار ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ تعدادِ اشاعت ایک ہزار، خوبصورت گٹ اپ، درمیانی تقطیع ۲۶۵ صفحات، آفسٹ چھپائی، معیاری کاغذ، مضبوط جلد، قیمت -/۶۵ روپے، قیمت کے لحاظ سے بھی یہ سلیم احمد کی سب سے مہنگی کتاب ہے۔ "مشرق" صوری خوبیوں کے لحاظ سے مصنف کی سب سے نمایاں کتاب ہے۔

اس کا سرورق اسلم کمال نے بنایا ہے۔ بیک ٹائیٹل پر سلیم احمد کے صرف چہرے کی تصویر ہے۔ پاسپورٹ سائز کی اس تصویر کے اُوپر اور نیچے اِس کتاب کے بارے میں سراج مُنیر کی وہ رائے درج کی گئی ہے جو انہوں نے "چراغِ نیم شب" کے دیباچے میں پیش کی تھی۔ سراج مُنیر کا کہنا ہے۔

"مشرق" میرے نزدیک سلیم احمد کا ایک بہت ہی بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے بہت سے حصے میں نے سنے ہیں۔ اپنی کلّیت کو گرفت میں لینے کی ایک غیر معمولی اور بہت سفاک کوشش ہے۔ اگر مجھ سے اُردو کی پانچ اہم ترین نظموں کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تو میں تین اقبال کی، ایک مسدس حالی اور پانچویں "مشرق" کا انتخاب کروں گا۔" مصنف نے کتاب کے پیش لفظ میں (جو انہوں نے وفات سے صرف ۳۶ دن پہلے لکھا تھا) کہا ہے۔ "یہ نظم نہیں میری روح کا رزمیہ ہے۔"

"چند ضروری گزارشات" کے عنوان سے شمیم احمد نے لکھا ہے کہ یہ کتاب مکمل شکل میں نہیں چھپ سکی۔ مختلف بکھرے ہوئے اوراق یکجا کرنے میں مرحوم کی بیٹی قرۃ العین سلیم، معین الدین احمد اور جمال پانی پتی نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔

"سخنہائے گفتنی" کے عنوان سے کتاب کے ناشر افتخار عارف نے سلیم احمد کا یہ چوتھا شعری مجموعہ شائع کرنے پر اپنے اعزاز وافتخار کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے دانشوروں کو سلیم احمد کا فکری اور فنی مقام از سر نو متعین کرنے کی دعوت بھی دی ہے۔ اُن کا کہنا ہے۔ "مشرق میرے لئے تو سلیم بھائی کی ایک یادگار اور اہلِ شعر وادب کے لئے ایک سوغات ہے۔"

"مشرق" کی نظموں کی فہرست درج ذیل ہے:۔

فصل اوّل

۱۔ مشرق ہار گیا ۲۔ میں اور وہ ۳۔ مکاشفہ ۴۔ نام کا سفر

۵۔ آیئے کھیولی چلیں ۶۔ جہاں دل کو بیچا جہاں جاں خریدی ۷۔ بہار کالونی سے جہانگیر روڈ تک

ہم لوگ

۸۔ البم نمبر ۱ ۹۔ اسٹوڈیو نمبر ۹ ۱۰۔ صنم کدہ پروڈکشنز ۱۱۔ البم نمبر ۲

فصل دوم

۱۲۔ کافی ہاؤس (۱) ۱۳۔ کافی ہاؤس (ب) ۱۴۔ نیا دور ۱۵۔ در ہجوِ شاعری

۱۶۔ نیند سے پہلے ۱۷۔ ڈِنر ۱۸۔ قصرِ سیاہ ۱۹۔ نیند کی وادی

"مشرق" اگر مکمل صورت میں چھپتی تو سلیم احمد کے منصوبے کے مطابق اس کے تین حصّے ہوتے۔ا۔ مشرق، ب۔ مغرب، ج۔ ربّ المشرقین و المغربین ، نیز اس میں ۲۹ یا ۳۰ ہزار مصرعے ہوتے۔ موجودہ کتاب میں صرف ساڑھے چار ہزار مصرعے ہیں۔ اُردو کی طویل نظموں میں "مشرق" ایک اہم اضافہ ہے۔ اس کے فکری وفنی مرتبے کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

۱۳۔ کلیاتِ سلیم احمد

سلیم احمد کے سابقہ چار مجموعہ ہائے کلام میں "بازیافت" شامل کر کے " کلیاتِ سلیم احمد " کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ الحمرا پبلشنگ اسلام آباد نے 2003ء میں الحمراء پرنٹنگ اسلام آباد سے پہلی بار طبع کرایا۔ جُملہ حقوق پبلشر شفیق ناز کے نام محفوظ ہیں۔ تعداد اشاعت نہیں درج ہے۔ قیمت مبلغ -/495 روپے ہے۔ مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش کے ساتھ ۶۶۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق سلیم احمد کی رنگین تصویر کے ساتھ دیدہ زیب ہے۔ بیک ٹائیٹل پر بھی سلیم احمد کی قدرے بڑی تصویر ہے اور ریاض فرشوری کی رائے کا اقتباس درج ہے جو "بیاض" کی اشاعت اوّل میں ہے۔ اندرونی فلیپ پر سلیم احمد کی مختصر سوانح درج ہے۔ دوسرے فلیپ پر سلیم احمد کے فکروفن کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی وقیع رائے درج ہے۔ ہر حوالے سے یہ ایک قابل قدر کاوش ہے۔ تاہم پروف کی اغلاط کھٹکتی ہیں۔ امید ہے کہ اشاعتِ ثانی میں انہیں رفع کرلیا جائے گا۔

"بازیافت" میں ۳۰ غزلیات، ۵۱ قطعات اور ۱۳ نثریے شامل ہیں اِن میں سے کچھ روایت نمبر ۴ میں بھی چھپ چکے ہیں۔

سلیم احمد بحیثیت نقّاد

اُردو تنقید کا ارتقاء

ایک انتہا پسندانہ نقطہ ءنظر یہ بھی ہے کہ اُردو میں تنقید کا وجود سرے سے ہے ہی نہیں ۔ ان انتہا پسندوں میں کلیم الدین احمد کا نام سرِ فہرست ہے جنھوں نے اُردو تنقید کو " اقلیدس کا خیالی نقطہ "یا" معشوق کی موہوم کمر" [۲] کہا ہے ۔ یہ بجا ہے کہ اُردو تنقید عالمی تنقید سے لگا نہیں کھاتی لیکن یہ اس قدر بے مایہ بھی نہیں ۔ دراصل برِ عظیم کے انحطاط پذیر عہد اور جاگیر دارانہ ماحول میں ایک جمود سا رہا ہے ۔ اس کے سایے ہر شعبہ ءحیات خصوصاً ادب اور تنقید پر بھی نظر آتے ہیں ۔ اُردو ادب میں ایسی کوئی بڑی تحریک نہیں رہی جسے تنقیدی سرمایہ قرار دیا جا سکے ، لیکن وہ عہد وہ ماحول اب کافی حد تک بدل چکا ہے ۔ ڈاکٹر شارب ردولوی نے اردو تنقید کا مفصل جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے ۔ "اب اُردو تنقید کے فرسودہ سانچے بدلے ہوئے نظر آتے ہیں ۔" [۳]

اُردو تنقید کے جدید دور سے پہلے ، اگر اس کے آغاز وارتقاء پر نظر ڈالیں تو شروع میں یہ شعراء کے مختلف تذکروں کی صورت میں نظر آتی ہے ۔ میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعراء (۱۷۵۱ء) اُردو شعراء کے تذکروں کا نقطہ ءآغاز کہا جاتا ہے ۔ اس دور میں کئی اور تذکرے بھی لکھے گئے ۔ مگر "اِن تذکروں کے اندر تختی سے کسی ایسی چیز کی تلاش کرنا جو ادبی ، فنی یا تنقیدی نقطہ ءنظر سے مکمل ہو ، مناسب معلوم نہیں ہوتا ۔ " محمد حسین آزاد ، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی نے اُردو تنقید میں گرانقدر اضافے کئے ۔ "مقدمہ شعر و شاعری" بے شک جدید اُردو تنقید کا نقطہ آغاز ہے ۔

بیسویں صدی میں مغربی اثرات کی وجہ سے اُردو تنقید تعریف و توصیف کے دائرے سے نکل کر

سماجی اور نفسیاتی تجزیے کی حدود میں داخل ہوئی۔ ذوق ووجدان کی بجائے سیاسی وسماجی شعور سے راہنمائی حاصل کی جانے لگی سیر سیّد اور حالؔی کی افادی تنقید کے ردِ عمل میں کچھ عرصے کے لئے رومانوی تنقید کی تحریک بھی چلی لیکن یہ ترقی پسند تحریک کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکی۔

بیسوی صدی میں اُردو کے ناقدین نا صرف رومانوی تحریک سے بلکہ دیگر مختلف عالمی (اور ادبی) تحریکوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ہندو پاک میں تنقید کا کوئی مستقل دبستان تو شاید مشکل ہی نظر آئے گا البتہ ہر دبستان کے زیادہ یا کم اثرات مختلف تنقید نگاروں پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ممتاز حسین، احتشام حسین اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ نے ترقی پسندانہ تنقید کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مگر ڈاکٹر تحسین فرقی نے لکھا ہے۔ کہ "ترقی پسند تحریک ادبی بہت کم تھی۔"[۴]
جمالیاتی تنقید نگاروں میں نیاز فتح پوری اور فراق گورکھپوری کا نام نمایاں ہے۔ کلیم الدین احمد انتہا پسند نقاد ہیں۔ انہوں نے نفسیاتی تنقید بھی لکھی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا بھی نفسیات اور دھرتی پوجا کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اُردو تنقید کو گرانقدر تحریروں سے نوازا ہے۔ محمد حسن عسکری اگرچہ تنازعات برپا کرنے والے نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن عسکری کی تحریروں میں جو تنقیدی بصیرت اور بین الاقوامی وژن جھلکتا ہے وہ اُردو تنقید پر کم مائیگی کا الزام دھرنے والوں کے لئے ایک مثبت جواب ہے۔

کچھ نقاد ایسے بھی جنہوں نے ہر دبستان کے اچھے اصولوں کی مدد سے اپنی تنقید کے معیار کو سنوارا ہے۔ اِن میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا کے نام اہم ہیں۔

جدیدیت کے نام پر بھی اُردو ادب اور اُردو تنقید میں ایک نئی تحریک شروع کرنے کی کوشش کی گئی۔ اِن لوگوں کا مؤقف یہ ہے۔ "ہماری تنقید ابھی تک معروضی جسارت سے محروم رہی ہے۔ ماضی اور حال پر تبصرہ اور تنقید کرتے ہوئے ہمارا روّیہ جذباتی اور توصیفی رہا ہے اور اس میں صنم تراشی کا روّیہ غالب ہے۔"[۵] اس تحریک کے حوالے سے افتخار جالب، انیس ناگی، زاہد ڈار ار جیلانی کامران کے نام اہم ہیں۔ اس گروہ پر میراجی کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ یہ تحریک دراصل ترقی

پسند اور اس کے بعد پاکستانی ادب کی تحریک کا ردِّ عمل تھی۔ اسلامی اور پاکستانی ادب کے حوالے سے صمد شاہین، ممتاز شیریں اور حسن عسکری کی تنقیدات وتخلیقات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

قیام پاکستان کے بعد، زندگی کی بدلتی ہوئی صورت حال کا جس قدر گہرا شعور حسن عسکری کو حاصل ہوا، شاید کوئی دوسرا نقاد اسے حاصل نہ کر سکے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا پاکستان کو درپیش خارجی مسائل سے ہٹ کر اُن کا رخ نسبتاً داخلی مباحث اور فکری معاملات کی طرف ہوتا گیا۔ آخر میں عسکری کی آواز سے ایک تلخی اور یاس ٹپکنے لگی تھی اور وہ اُردو ادب خصوصاً پاکستانی ادب کی موت کا اعلان کرنے لگے تھے۔ یہی وہ دور ہے جب سلیم احمد دنیائے نقد وادب میں وارد ہوئے۔

سوال یہ ہے کہ اُن کے تنقیدی سفر کے مختلف سنگہائے میل کون کون سے ہیں؟ اُن کے موضوعاتِ تنقید کیا تھے؟ اُن کا تنقیدی طریقہ کار کیا رہا؟ اور مجموعی حیثیت سے اُردو تنقید میں سلیم احمد کا کیا مقام بنتا ہے؟ ان سوالوں کے جواب تفصیل طلب ہیں۔

سلیم احمد کے تنقیدی موضوعات

سلیم احمد نے اپنا پہلا تنقیدی مضمون ۱۹۴۸ء میں لکھا اور آخری ۱۹۸۳ء میں۔ اِن چھتیس برسوں میں ان کی تنقیدات کے چھ مجموعے شائع ہوئے جبکہ دو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ اِن آٹھ تنقیدی کتب میں سے پانچ متفرق تنقیدی مضامین پر مشتمل ہیں جبکہ تین مختلف ادبی شخصیات کے فکروفن کا محاکمہ ہے۔

مذکورہ بالا کتب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ سلیم احمد نے زیادہ تر شاعری کی تنقید لکھی یا تنقید کی تنقید (نقدِ تنقید)۔ شاعری اور تنقید کے ضمن میں بھی اُن کی توجہ زیادہ تر درج ذیل موضوعات پر مرکوز رہی۔ ۱۔ "ادب اور زندگی" کے حوالے سے مسائل و افکار، ۲۔ غالبیات، ۳۔ سرسیّد تحریک، ۴۔ اقبالیات، ۵۔ محمد حسن عسکری، ۶۔ ہمعصر شخصیات، ۷۔ ادبی مسائل، ۸۔ تہذیبی مسائل، ۹۔ متفرق موضوعات۔

۱۔"ادب اور زندگی"

سلیم احمد زندگی کے حقائق اور مطالبات سے آشنا نقاد تھے۔ اس سلسلے میں اُن کا پہلا تنقیدی مضمون "زندگی ادب میں" ہی اِس امر کی نشاندہی کر دیتا ہے کہ آگے چل کر یہ نوآموز نقاد زندگی کی کلّیت کو گرفت میں لینے کی کوشش کرے گی۔ مذکورہ مضمون میں سلیم احمد نے لکھا۔ "سوال یہ ہے کہ زندگی کیا ہے؟۔۔۔ایک "حرکی رو"۔۔۔۔زندگی اپنی ارتقاپذیر شخصیت کو بہتر سے بہتر پیکر میں ظاہر کرنے کے لئے انسانی معاشرہ کو توڑ پھوڑ کر نئے سرے سے بناتی ہے۔"

۱۹۴۸ء میں جب یہ مضمون لکھا گیا تو "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کی بحث عام تھی۔ سلیم احمد مؤخر الذکر نظریے کے حامی تھے۔ انہوں نے اوّل الذکر نظریے کے حامی نیاز فتح پوری کے جواب میں کہا کہ ادب زندگی کے شعور کا نام ہے اگر یہ شعور اجتماعی ہو تو ہم صداقت تک جلد پہنچ جاتے ہیں۔ سلیم احمد نے ترقی پسند حضرات کے ساتھ بھرپور اور مدلّل اختلاف کیا اور اس سلسلے میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کا انداز جارحانہ ہوتا چلا گیا۔ اس میں سلیم احمد نے لکھا ہے۔ "ابھی ہمارا ادب زندگی کو ایک ایسی عینک سے دیکھتا ہے جو اس نے فرائیڈ اور مارکس کی دُکان سے بغیر اس بات کا لحاظ کئے ہوئے خریدی ہے کہ اس کا نمبر اس کی آنکھوں کے لئے ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔"

۱۹۴۸ء ہی میں سلیم احمد نے ایک اور مضمون "ادبی اقدار" لکھا۔ اس مضمون میں بھی مذکورہ بالا مضمون کے مباحث کو دہرایا ہے۔ یعنی انسانی فطرت اپنے بنیادی تقاضوں بھوک، پیاس، نیند اور جنس وغیرہ کے باوجود محض اِن تقاضوں کی اسیر ہو کر نہیں رہ سکتی۔

۲۔غالبیات

سلیم احمد کی تنقیدات کا دوسرا اہم شعبہ "غالبیات" ہے اُن کا پہلا مضمون "غالب کی انانیت" (۱۹۵۹ء) ہے جبکہ دوسرا مضمون "غالب اور نیا آدمی" (۱۹۶۰ء) اور تیسرا اہم مضمون

"غالب اور انسانی رشتے" (۱۹۶۵ء)۔ اُن کی باقاعدہ تنقیدی کتاب "غالب کون؟" ہے۔ ابتدائی تینوں مضامین میں "غالب کون؟" کا ہیولیٰ نظر آتا ہے گویا اس کتاب کا خاکہ ایک عرصے سے اُن کے ذہن میں بن رہا تھا۔

"غالب کون؟" کُل سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے مضمون کا آغاز ٹی ایس ایلیٹ کے اس فقرے سے ہوتا ہے۔ "شاعری شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ شخصیت سے فرار ہے۔" باقی سارے مضمون کی عمارت اس فقرے پر استوار کی گئی ہے۔ شروع میں تو انہوں نے ڈرامائی انداز میں اِس فقرے کو سمجھنے سے معذوری کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کبھی نظیر صدیقی کے پاس جاتے ہیں اور کبھی ممتاز حسین، لارنس اور برگساں کے پاس۔

شخصیت ذات سے الگ ایک چیز ہے جس طرح بَس (ذات) اور ڈیزل (شخصیت) ہو۔ کوئی حسینہ آپ کی تعریف کر دے، شاعر کو داد مل جائے یا آپ کسی بچے کی حوصلہ افزائی کریں تو یہ شخصیت خُوب پھلتی پھولتی ہے۔ حکومتیں "بڑے بچوں" کو اسی طرح تمغے اور اعزازات دے کر قیدی بناتی ہیں۔ شخصیت کا ایک رخ مثبت ہوتا ہے اور ایک منفی۔ منفی صورت میں ڈاکو اور انقلابی پیدا ہوتے ہیں۔ فراق نے تو یہاں تک لکھا ہے "ہر نیا پیغمبر ایک معنوں میں لادین ہوتا ہے۔"

سلیم احمد نے غالبؔ کو سمجھنے سمجھانے یا رد کرنے کے لئے جو نفسیاتی فارمولے پیش کئے ہیں وہ خاصے متاثر کُن ہیں۔ اِن نفسیاتی اُصولوں کی وضاحت کے لئے جو مثالیں دی گئی ہیں، نہایت عمدہ ہیں۔ مثلاً اسلوب کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ اُردو کے نامور شعراء کے اسالیب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک ایک فقرے میں مذکورہ شعراء کی پوری شخصیت اور فن سمٹ آیا ہے۔ مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "اُردو زبان کا کوئی اسلوب ایسا نہیں جو میرؔ کے کلام میں نہ پایا جاتا ہو۔ اقبال کا اسلوب ایک ایسے نیم فلسفی کا ہے جو دوسروں کو بے خبر جان کو عمل کی تلقین کرنا چاہتا ہے۔ حالؔی بھی بے خبروں کو تلقین کرتے ہیں مگر ان کی سطح پر اُتر کر۔"

سلیم احمد نے اپنے وضع کردہ فارمولوں کی مدد سے غالب کی شخصیت اور اُس کے فکر و فن کا جو

نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ اُس نے غالبؔ کی اُس تصویر کو پارہ پارہ کر دیا ہے جو غالبؔ کو پڑھنے والوں کے ذہن میں ایک سو سال سے بن چکی تھی۔ اگر چہ غالبؔ پر یگانہ (غالب شکن) نے بھی تابڑ توڑ حملے کیے لیکن یگانہؔ کے پیروکار، سلیم احمد نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ "۔۔۔۔عُرف مرزا نوشہ جسے کوئی جانتا نہیں، اسدؔ سے وہ خود بیزار ہے۔ نجم الدولہ اور دبیر الملک، جس شاہ سے القابات ملے تھے وہ خود اپنے تئیں فقیر بادشاہ کہتا تھا۔ ہاں البتہ اُسے اپنے نام کے ساتھ بہادرؔ لگانا بہت عزیز تھا۔ محمدؐ سے پرہیز کرتے تھے۔ پھر اُسے کس نام سے پکاریں؟ چلئے سیدھا سادا غالبؔ ہی کہے دیتے ہیں۔"

انہوں نے "غالب کون؟" میں کلامِ غالب سے جتنی بھی مثالیں دی ہیں وہ غالب کو انا شکن نہیں بلکہ انا پرست ثابت کرتی ہیں۔ مختصر یہ کہ "غالب کون؟" نے لوگوں کو چونکایا ضرور ہے اور وہ پھر سے غالب کو پڑھنے اور سمجھنے لگے۔ سلیم احمد اپنے پُر زور اور پُر شور اندازِ بیان میں وقتی طور پر قاری کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں۔

۳۔ سرسیّد تحریک

غالبؔ کے بعد سرسیّد تحریک کے حوالے سے سلیم احمد نے زیادہ تر تنقیدی مضامین لکھے۔ اس موضوع پر اگر چہ اُن کی کوئی مستقل کتاب تو نہیں ہے لیکن "بابائے جدیدیت" کے نام سے وہ ایک ایسی کتاب لکھنا ضرور چاہتے تھے۔

سلیم احمد نے صرف تحریک کے متعلقین کے حوالے سے قلم اُٹھایا بلکہ مخالفین کے نقطہ نظر کو بھی سامنے رکھا۔ اُن کی مختلف کتب میں درج ذیل مضامین مذکور بالا موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔

۱۔ اکبر اور اُن کا زاویہ نظر مشمولہ ادبی اقدار ۱۹۵۶ء

۲۔ غزل، مظفر اور ہندوستان مشمولہ نئی نظم اور پورا آدمی ۱۹۶۲ء

۳۔ گڈ بائی ٹو سرسیّد مشمولہ نئی شاعری نامقبول شاعری ۱۹۸۹ء

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پہلے مضمون سے تیسرے مضمون تک سلیم احمد کے خیالات کا سفر

نہایت مربوط ہے۔ یہ منتشر یا زِگ زیگ صورت میں نہیں ہے۔ انہوں نے شروع میں جو مؤقف اختیار کیا، نہایت سوچ سمجھ کر کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ سرسیّد تحریک کے بارے میں سلیم احمد کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ ان خیالات میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی۔

دوسری خاص بات یہ ہے کہ سرسیّد تحریک میں سرسیّد کے علاوہ انہوں نے مولانا حالؔی پر زیادہ لکھا کیونکہ حالؔی کی شخصیت اور تحریریں اس دور میں مرکزی حیثیت کی حامل ہیں۔

سرسیّد تحریک کے حوالے سے سلیم احمد کے خیالات جاننے سے پہلے یہ بات سب اہلِ علم کے سامنے رہے کہ یہ تحریک مسلسل نزاع اور بحث و تمحیص کا موضوع رہی ہے بقول سلیم اختر "سرسیّد تحریک نزاعی تھی ایک صدی قبل بھی اور آج بھی۔"[۶] سلیم احمد کا خیال ہے کہ یہ نزاعی تحریک اب اپنے انجام کو پہنچ رہی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ سرسیّد نے جو دائرہ کھینچا تھا وہ اب مکمل ہو رہا ہے۔ اب ہمیں اپنی قومی ترجیحات کے لئے ایک نئے دائرے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں لکھا۔ "سرسیّد کی تحریک دراصل نئے حالات سے مفاہمت کی تحریک تھی۔ اس تحریک نے اس سے زیادہ کچھ اور مطالبہ نہیں کیا۔"

سلیم احمد کا خیال ہے کہ سرسیّد احمد خاں کے چھوڑے ہوئے کام کو "مدرسہ دیوبند" کے اکابرین نے آگے بڑھایا۔ یہ تحریک مولانا الطاف حسین حالؔی کے فرمان کے مطابق ہوا کا رُخ دیکھ کر پھرنے والی نہ تھی بلکہ اکبرالہ آبادی کے اس منشور پر عمل پیرا تھی۔

ناز کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانے نے تمہیں   مرد ہیں وہ جو زمانے کو بدل دیتے ہیں۔

دراصل مولانا حالؔی اور مولانا اکبرالہ آبادی دونوں "مولانا" ایک ہی اعلٰی مقصد کے لئے کوشاں تھے یعنی اصلاح کے ذریعے قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کا مقصد لیکن دونوں کے طریقِ کار میں اختلاف تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے۔ "اس مقصد کے لئے حالؔی نے مثبت اور اکبر نے منفی طریقِ کار اختیار کیا ہے۔"[۷]

پاکستان میں اور عالمی سطح پر بھی مختلف اسلامی اور انقلابی تحریکیں اب اسی "امتزاجی رویے" پر

گامزن ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے سر سیّد احمد خاں کی نیّت کو بخیر قرار دیتے ہوئے ایک بار کہا تھا۔ "قوم و ملک سے انہیں (سر سیّد کو) جو بے لوث محبت تھی شاید اس خلوص کے طفیل روزِ محشر ان کی بخشش ہو جائے۔"[8]

سلیم احمد کے شعور یا لاشعور میں ایک نئے سر سیّد یا ایک نئے حالؔی کا کردار اپنانے کا کوئی خیال تھا یا نہیں؟ لیکن یاروں نے تاڑ لیا اور پھبتیاں کسنا شروع کر دیں۔ مجتبیٰ حسین نے کہا۔ "سلیم احمد کی مولانا حالؔی سے ناچاقی کی ایک وجہ یہ تو نہیں کہ انہوں نے مولانا حالؔی کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا ہے۔"[9]

اس طرح انتظار حسین نے بھی اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا۔ " کہیں مرا یار شعر و ادب کو تیاگ کر خالص مصلح نہ بن جائے۔"[10]

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا حالؔی کی شیروانی تو سلیم احمد نے بھی پہن رکھی تھی لیکن اُن کے پاس حالؔی کا مفلر نہیں تھا۔ حالؔی کی طرح سلیم احمد کی شیروانی کے اندر بھی غزل اور قوم دونوں کا عشق بدرجہء اتم موجود ہے لیکن یہ دونوں عشق (غزل کا اور قوم کا) خالص مصلحانہ رنگ کی بجائے خالص ادبی رنگ میں اپنا اثر دکھاتے ہیں اس حوالے سے سلیم احمد کا ایک اور وقیع مضمون "غزل مفلر اور ہندوستان" ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے "غزل" کے حوالے سے ہندوستان کی سیاسی تحریک کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ ادب و سیاست کا خوبصورت امتزاج ہے۔

سلیم احمد حالؔی کے خیالات کے بارے میں کہتے ہیں کہ نوجوان تو ہر زمانے کے ایک سے ہوتے ہیں۔ ان کی اٹھتی جوانی کا پہلا مسئلہ وہی ہوتا ہے جو کچھ کو کوٹھے پر، کچھ کو حوالات میں اور باقیوں کو شادی کی طرف لے جاتا ہے۔ سلیم احمد کا اعتراض یہ ہے۔ "ہمیں افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مولانا حالؔی کی نئی غزل ہمیں اپنے نوجوانوں کے جنسی مسائل کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ ممکن ہے اُس زمانے کے نوجوانوں کے کوئی ایسے مسائل ہی نہ ہوں اور انہیں صرف پتلون پہننے کا شوق ہو۔"

وہ کہتے ہیں کہ اگر حسرت کی غزل اس احساسِ گناہ کا کتھارسس نہ کرتی تو نجانے ہماری اجتماعی نفسیات کیا ہوتی! سر سیّد کے زیر ہدایت پروان چڑھنے والی شاعری، خصوصاً حالی کی اصلاح پسند غزل کا نتیجہ یہ نکلا۔"

ا۔ سیاست میں دلیرانہ آزادی کی بجائے انگریزوں سے ملازمت مانگنا۔

۲۔ غزل میں تغزل کی چاشنی کے ساتھ عشق کی بجائے ملازمت مانگنے والوں کی راہنمائی اور حوصلہ افزائی کرنا۔ سیاست میں قومی خدمت کا نعرہ انگریزوں کی وفاداری کے ساتھ۔

۳۔ نظموں میں حب الوطنی کا چرچا انگریزوں کی مدح کے ساتھ۔"

سلیم احمد جراءت مند عشق اور جراءت آموز سیاست کے قائل تھے۔ چنانچہ انہیں حسرت موہانی کا یہ نعرہ بہت پسند آیا۔ "ہوم رُول نامردوں کا نعرہ ہے، ہمیں کامل آزادی چاہیے۔"

انہیں غزل میں حسرت ہی کا بے باکانہ اظہار پسند آیا۔ حسرت کے ہمعصروں اصغر گونڈوی، فانی بدایوانی اور جگر مراد آبادی کی شاعرانہ واردات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے سلیم احمد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ سب حضرات دامن بچالینے کی پالیسی پر گامزن رہے۔ سیاست میں بھی اور عشق میں بھی، یہ نہ محبوب کو گلے لگانے پر آمادہ تھے نہ آزادی کو، ان حالات میں حسرت ہی مرد میداں ہے۔ بقول سلیم احمد

" تحریکِ خلافت عشق کی سیاست تھی اور حسرت کی غزل سیاست کا عشق، دونوں ایک دوسرے کا پیمانہ تھے۔"

سلیم احمد نے غزل میں حالی کی طرف سے نوجوانوں کے جنسی مسائل سے عدم توجہی پر تنقید کی ہے۔ فضیل جعفری کو سلیم احمد کی یہ روش پسند نہیں آئی۔ انہوں نے لکھا۔ "۔۔۔اب اُس زمانے کے نوجوان تو رہے نہیں کہ سلیم احمد کو اپنے مسائل کے بارے میں بتاتے اور تصدیق کے لئے پردہ نشینوں کے نام پتے بھی لکھواتے جاتے۔"!!

وارث علوی نے بھی سلیم احمد کے روّیے پر سخت تنقید کی۔ انہوں نے لکھا۔ " آج کا انسان حالی

کو مار کر محض بیالوجیکل سطح پر جی سکتا ہے۔ سلیم احمد کا مضمون (غزل مظفر اور ہندوستان) اس قتل کی طرف پہلا قدم ہے۔" [۱۲]

شاید یہ فضیلؔ، وارثؔ اور دیگر سخت گیر ناقدین کے مضامین ہی کا نتیجہ تھا کہ سلیم احمد نے ایک مضمون لکھا" گڈ بائی ٹو سرسیّد" ۔ یہ مضمون سرسیّد کے حوالے سے سلیم احمد کا "بیان صفائی" کہا جا سکتا ہے۔

سرسیّد اور حالیؔ سے سلیم احمد کا اختلاف بنیادی اور اُصولی رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں حالی پر تنقید لوگوں سے ڈر کر یا انہیں خوش کرنے کے لئے نہیں کرتا۔ سرسیّد اور حالی کے ساتھ اُن کا کوئی نسلی تنازعہ نہیں ہے۔ مُردوں سے لڑائی ویسے بھی اچھی نہیں ہوتی لیکن سلیم احمد کے بقول حالیؔ تو زندوں سے زیادہ زندہ ہیں۔ یہ سرسیّد ہی ہیں جنھوں نے ہمارے پورے نظامِ تعلیم کو کاندھوں پر اُٹھا رکھا ہے۔

"سرسیّد سے میرا اختلاف نہ ذاتی ہے نہ باپ بیٹے کا۔ یہ اختلاف ایسا ہے جیسا دن کو رات سے ہوتا ہے۔ چلئے آپ مجھے رات اور انہیں دن سمجھ لیجئے۔ خُدا کا شُکر ہے کہ مجھے (سرسیّد کی) کسی اصلاحی تحریک سے فیض پہنچا نہ مذہبی تحریک (دیوبند) سے۔ میں نے ان کے نظامِ تعلیم سے اتنا واسطہ بھی نہیں رکھا کہ اُن کی دی ہوئی ڈگری سے روٹی کماتا۔ میں نے روٹی ان کی مدد اور سند کے بغیر کمائی ہے۔"

سلیم احمد کو تشویش یہ ہے کہ ہر طرف وہ لوگ ہیں جو یا تو سرسیّد کے مدرسے سے فارغ التحصیل ہیں یا دیوبند سے۔ کوئی بچ کر جائے تو جائے کہاں؟ سلیم احمد کہتے ہیں کہ مسٹر اور مولوی دونوں ہی میرے کام کے نہیں۔ میں کچھ اور بننا چاہتا تھا۔ خدا بھلا کرے عسکری صاحب اور کرّار صاحب کا انہوں نے مجھے تاریکی میں روشنی عطا کی۔

سلیم احمد دُعا کرتے ہیں کہ سرسیّد کا سرچشمہ اور دیوبند کا دریا دونوں مل جائیں تو امت کی ہر کھیتی سرسبز ہو جائے گی۔ اُن کے بقول "ہمارے اس کام میں خود روحِ سرسیّد ہمارے لئے دست بہ دُعا ہے۔"

۴۔ اقبالیات

اقبال وہ خوش نصیب شاعر ہے جس پر اُس کی زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی، بہت کچھ لکھا گیا۔ بطورِ خاص ۱۹۷۷ء میں جشنِ اقبال کے حوالے سے تو ذخیرۂ اقبالیات میں بے حد اضافہ ہوا۔ گو اس میں بہت کچھ فرمائشی بھی تھا لیکن کچھ چیزیں خاصے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ "اقبال۔ایک شاعر" پہلی بار ۱۹۷۹ء میں منظرِ عام پر آئی۔

سلیم احمد کو اپنے کالج کے زمانہ طالب علمی ہی سے اقبال سے، بہت دلچسپی تھی۔ بعدازاں سلیم احمد نے اقبال کے فکر وفن پر تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی لکھنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں سلیم احمد کا پہلا مضمون "ضرب کلیم۔شاعری یا فلسفہ "۱۹۵۸ء میں لکھا گیا۔ سلیم احمد نے ضرب کلیم کو شاعری اور فلسفہ کا بہترین امتزاج قرار دیا جبکہ "اقبال۔ایک شاعر" میں اقبال کو ایک مختلف انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ سلیم احمد نے اقبال کو خود اقبال اور اپنے اندر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے "اقبال۔ایک شاعر" کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔ "اقبال کے بارے میں ہماری تنقید دل میں چور رکھ کر بات کرنے کی عادی ہوگئی ہے۔"

اِس دیباچے میں سلیم احمد نے اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھا ہے۔ عظیم المرتبت شاعر کو محض ایک خاص علاقے (پنجاب) تک محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ پنجاب کے اقبال، پنجاب کی اُردو اور پنجاب کی حکومت کے خلاف پہلے بنگلہ دیش میں ردّ عمل ہوا اور قاضی نذرالاسلام اور رابندر ناتھ ٹیگور جیسے دوسرے درجے کے شعراء کو اقبال کے مدّ مقابل لایا گیا اور اب سندھ میں بھی اس قسم کا ردِّ عمل ابھر رہا ہے۔ سلیم احمد کہتے ہیں۔ "اقبال کے بارے میں پنجاب سے ڈر کر ہم نے اقبال سے نفرت کرنی سیکھی ہے، محبت کرنی نہیں سیکھی۔"

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سلیم احمد نے "اقبال بیزاری" پیدا کرنے والے جس عنصر (پنجاب) کا ذکر کیا ہے وہ پنجاب نہیں بلکہ "ہندو" ہے جس نے پہلے بنگلہ دیش بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور اس مقصد کے لئے پنجاب بیزاری، اقبال بیزاری اور مرکز گریز تحریک شروع کی اور اب انہی

تجربات کو کام میں لاتے ہوئے سندھ میں بھی سر گرم عمل ہے۔ اس معاملے میں سلیم احمد اور آگے بڑھتے ہوئے یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ اقبال کو محدود کر دینے یا اقبال سے لاتعلقی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دوسرے بڑے شعراء کے برعکس اقبال کا فیض آگے کسی کو نہیں پہنچا۔ "اقبال کا سلسلہ نسب (شاعری میں) اس طرح منقطع ہوا ہے جیسے اقبال کی آواز ان کے بعد کے شعراء کی سماعت تک نہ پہنچی ہو۔"

سلیم احمد کی یہ بات محلِ نظر ہے۔ اسدؔ ملتانی، امین حزیںؔ سیالکوٹی اور ماہر القادریؔ کو تو خیر سلیم احمد بھی قابلِ اعتناء نہیں سمجھتے لیکن جگرؔ مراد آبادی، فیضؔ، راشدؔ، اخترؔ شیرانی، احسانؔ دانش، حفیظ جالندھری اور ناصرؔ کاظمی کی شاعری پر اقبال کے گہرے اثرات کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے ۔ یوں بھی ہر بڑے شاعر کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لاولد رہ جاتا ہے۔ نیز بعد میں آنے والے بڑے شعراء "شاعرِ کبیر" سے کنی کترانے اور اپنی انفرادیت کو بچانے کی شعوری کوشش بھی کرتے ہیں۔

"اقبال ۔ ایک شاعر" کے پہلے مضمون "ایک سچے شاعر کا المیہ" میں سلیم احمد نے میرؔ، غالبؔ، انیسؔ اور حالیؔ کے ہاں مرکزی مسئلوں کا ذکر کرنے کے بعد "موت" کو اقبال کی ذات کا مرکزی مسئلہ قرار دیا ہے۔

دلائل یہ ہیں کہ بانگ دراؔ کی تین نظمیں گورستانِ شاہی، عشق اور موت اور والدہ مرحومہ کی یاد میں، موت کی عکاسی کرتی ہیں۔ بالِ جبرئیل کی دو بہترین نظمیں ساقی نامہؔ اور مسجد قرطبہ بھی موت کا فلسفہ پیش کرتی ہیں۔ حالانکہ انہوں نے تو اسرار خودی میں اُن اقوام وملل پر تاسف کا اظہار کیا ہے جو موت کی تمنا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر انیس ناگی بھی سلیم احمد سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقبال اگر ملحد وجودیت پسند ہوتے تو پھر وہ موت کے تجربے سے خائف ہو کر انسان کے ارضی قیام سے مدراہر حقیقت کو رد کر دیتے۔ اقبال کے نزدیک اصل مسئلہ زندگی کا بامعنی دستورالعمل مرتب کرنا ہے۔ معمولی سی کوشش سے ہر شخص کی زندگی سے "موت کی خواہش" کے حوالے ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ خود سلیم احمد کی زندگی میں "خواہش مرگ" کے کئی شواہد ملتے ہیں

حالانکہ اپنی فکر اور شاعری میں وہ ہرگز موت پرست واقع نہیں ہوئے۔ مثلاً سکول کی زندگی میں خُود کشی کا ارادہ، کالج کے زمانے میں نظم موت کی تخلیق۔

"اقبال کی ایک داخلی تصویر" میں انہوں نے اقبال کی شخصی ناکامی اور بے عملی کے لئے انتہائی قلیل مواد پر مفروضہ قائم کیا ہے۔ آخر دینوی لحاظ سے کبھی بھی اقبال کو ناکام آدمی نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے اعلےٰ تعلیم حاصل کی۔ اعلےٰ مناصب پر فائز رہے۔ یہ الگ بات کہ اپنی شاعری کی خاطر وہ وکالت کے میدان میں بس اُسی قدر جاتے تھے جس سے اُن کی اچھی گزر بسر ہو سکے اور وقت کم سے کم ضائع ہو۔ انہوں نے عملی سیاست میں بھرپور حصّہ لیا۔ الیکشن لڑا اور سخت مقابلے کے بعد جیتا۔ مرض الموت کا شکار ہونے تک وہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر رہے۔ اسمبلی کی کارروائی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور آخر دینوی اعتبار سے کامیاب آدمی کی اور کون سی علامات ہیں؟ وہ دینوی کامیابیوں کے لحاظ سے ایک خوش قسمت شخص تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں عظیم شاعر کی تعظیم حاصل کی۔ مغرب نے ان کی شاعری کی داد دی۔ اپنی زندگی ہی میں مختلف زبانوں میں اپنے کلام کا ترجمہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ مسولینی نے اُن سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ سر کا خطاب حاصل کیا۔ رہا اکسٹھ برس کی عمر میں وفات پا جانے کا معاملہ۔ تو یہ ایک امرِ ربی ہے۔ کتنے بڑے نابغہ روزگار ایسے بھی گزرے ہیں جو جوانی ہی میں وفات پا گئے۔ خود سلیم احمد بھی صرف چھپن برس جیتے رہے۔

اس کتاب کا چوتھا مضمون "اقبال کا جہاد" ہے اس مضمون میں سلیم احمد نے عقل کے حوالے سے اقبال کی شاعری اور افکار کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ سلیم احمد کا اعتراض یہ ہے کہ آخر اقبال کے افکار میں یہ ثنویت کیوں ہے؟ اقبال شاعری میں عقل کی مخالفت کیوں کرتے ہیں اور اسے ابولہب اور ابوجہل کیوں کہتے ہیں؟ اس مضمون میں سلیم احمد کا تجزیہ یہ ہے۔ "عقل سے ان (اقبال) کی لڑائی نہ مغرب کی عقل سے لڑائی ہے نہ اس کا خارج کی کسی اور چیز سے تعلق ہے۔ ان کی لڑائی خود اپنی عقل سے ہے۔"

"اقبال - ایک شاعر" کا مضمون "اقبال کا سورۃ اخلاص" فلسفہء خودی ہے۔ اس مضمون میں بھی سلیم احمد نے اقبال کے نہاں خانہ، دل تک پہنچ کر نفسیاتی حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال ہیں تو کچھ اور لیکن بننا کچھ اور چاہتے ہیں۔

"موچی دروازے کی شاعری" کا آغاز سلیم احمد نے اس مفروضے سے کیا ہے کہ فیضؔ صاحب نے اقبال کو موچی دروازے کا شاعر کہا ہے۔ فیضؔ سے منسوب یہ بات تحریری صورت میں فیضؔ صاحب نے کہیں نہیں لکھی۔ اسی طرح فراقؔ نے بھی کہا (بحوالہ سلیم احمد) "یہ کوئی شاعری ہے جو مسلمانوں کا رونا دھونا کرتی رہتی ہے۔"

سلیم احمد کا خیال ہے کہ اقبال کی باقی شاعری سے قطع نظر "شکوہ" کی سب سے بڑی خوبی یا خرابی یہی ہے کہ یہ خالص مسلمانوں کی چیز ہے۔ اس کے فکری وفنی پہلوؤں پر بات کرتے ہوئے سلیم احمد کہتے ہیں کہ اقبال کا موضوع تو بہت وسیع ہے اور مسلمانانِ عالم پر پھیلا ہوا ہے لیکن "شکوہ" میں اقبالؔ اسے فنی حسن کے ساتھ ادا نہیں کر سکے تاہم یہ نظم "موچی دروازے" کی علامتی صورت میں مسلمانانِ برصغیر کے دلوں کی دھڑکن ہے۔ اسے فیضؔ یا فراق نہیں سمجھ سکتے۔ "اقبال کا معجزۂ فن" مسجد قرطبہ کے حوالے سے ہے۔ حسن عسکری نے علامہ اقبال کے بارے میں کم لکھا ہے لیکن سلیم احمد نے اس مضمون کا آغاز حسن عسکری کے ایک فقرے سے کر کے اقبالیات کے طالب علموں کو حیران کر دیا ہے۔ عسکری نے کہا تھا۔ "مسجد قرطبہ اُردو شاعری کا تاج محل ہے۔"

انہوں نے سوال در سوال کر کے اپنے خیالات ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔ اُن کا پہلا سوال یہ ہے کہ آخر اقبال کو سپین کی مسجدِ قرطبہ ہی کیوں پسند آئی۔ دہلی کی جامع مسجد یا کئی دوسری مساجد بھی موجود تھیں جو تعمیری نفاست کا منہ بولتا ثبوت ہیں جبکہ مسجد قرطبہ تو سنگینی اور صلابت کا اظہار ہے۔ سلیم احمد کہتے ہیں۔ "مسجد قرطبہ میں صلابت اور قوت کا وہ اظہار ہے جو اقبال کو حد درجہ پسند ہے لیکن شاہی مسجد ہندی مسلمانوں کی سادہ مردانگی کا اظہار ہے جس میں قوت حُسن سے گلے مل رہی ہے۔ اقبال نہ شاہی مسجد سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں نہ میر کی شاعری سے۔"

سلیم احمد کا خیال ہے کہ جس طرح اصل مسجد قرطبہ عظیم الشان ہے اسی طرح نظم "مسجد قرطبہ" بھی اپنی مثال آپ ہے۔ سلیم احمد نے اس نظم پر جو مضمون لکھا ہے، وہ بھی تنقید کا عمدہ نمونہ ہے۔

"اقبال کا ایک شعری کردار ابلیس" میں سلیم احمد لکھتے ہیں کہ ابلیس اقبال سے بہت مایوس ہے۔ اس ابلیس کو واقعی اقبال سے مایوس ہونا چاہیے۔ جہاں تک اقبال کے تنظیم پسند ہونے کا تعلق ہے تو اس تنظیم پسندی کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ اقبال کی زندگی کی بیشتر تفصیلات ہمارے سامنے ہیں۔ کیا تعلیم میں نمایاں کامیابی اور اعلےٰ تعلیم کا حصول بغیر کسی تنظیمی قوت کے ممکن ہے؟ ہزاروں پیشوں میں سے ایک دو پیشوں کا انتخاب اور ان کی عملی ادائیگی، پابند نظم کی شاعری، کتابوں کی طباعت و اشاعت، گھر بنوانا یا خریدنا، سیاست میں ایک ملک گیر تنظیم سے وابستہ ہو کر عملی طور پر مسلمانوں کو منظم کرنا، الیکشن لڑنا، اسمبلی کے اجلاس میں بھرپور شرکت کرنا وغیرہ بغیر کسی تنظیمی قوت کے ممکن ہے؟

سلیم احمد خود بھی اس امر سے واقف تھے۔ شاعرانہ زندگی میں ایسی بے عملی اور کاہلی کو کبھی بُرا نہیں سمجھا گیا خود سلیم احمد کی اندرون خانہ حالت کچھ ایسی ہی تھی۔

اس کتاب کا آخری مضمون "اقبال کا ایک شعری کردار، شاہین" ہے۔ یہ مضمون بھی کافی متنازعہ ثابت ہوا۔ وہ کہتے ہیں۔ "اقبال کو بچپن میں کبوتروں کا بڑا شوق تھا لیکن ان کے کبوتر جب اڑان پر آتے تو باز، شکرے اور بحریاں اِن کے کبوتر پکڑ لے جایا کرتے جس سے اقبال کو بڑا دکھ ہوتا تھا۔"

سلیم احمد نے کسی ثبوت کے بغیر یہ بھی کہا ہے کہ شاید اقبال کسی جسمانی یا جنسی عارضے میں مبتلا تھے تاہم شیخ اعجاز احمد نے اس کی سختی سے تردید کی ہے چنانچہ سلیم احمد کا نفسیاتی تجزیہ یہ ہے۔

"بعد میں بچپن کا یہی تجربہ ان کے تصورِ شاہین کی شکل میں برآمد ہوا۔ ذرا سی نفسیاتی باریک بینی سے اور کام لیا جائے تو ان کا تصورِ قوت، امام بخش گاماں پہلوان کی کشتی دیکھ کر پیدا ہوا ہوگا اور ممکن ہے کہ "ساقی نامہ" والا تصورِ حرکت سیالکوٹ کی کسی ندی میں نہانے کا ردِ عمل ہو۔"

سلیم احمد کے خیال میں اِس "بدنام شعری کردار" کو جاننے کی ضرورت ہے جس سے کچھ لوگوں نے فسطائیت اور بعض نے پنجابیت برآمد کرنے کی کوشش کی ہے۔ سلیم احمد اقبال کی جبلت اور زمین سے نفرت کے بارے میں کہتے ہیں۔

"رزق کی تلاش جبلت کا کام ہے اور اس کے لئے شاہین کو بھی اپنی بلندیوں سے نیچے آنا پڑتا ہے لیکن اقبال کے یہاں نیچے آنے کا عمل توانائی کے سرچشمے سے قریب ہونے کا عمل نہیں ہے بلکہ ایسا حقیر کام ہے جس کی تذلیل ہی کی جاسکتی ہے۔ اقبال جبلت اور زمین دونوں کو تذلیل کرتے ہیں۔ دونوں ان کے نزدیک گراوٹ اوگرفتاری کی علامت ہیں۔ فرد جبلت سے وابستہ ہوکر اپنی لاہوتیت کھو بیٹھتا ہے اور قومیں زمین سے وابستہ ہوکر اپنی حقیقی زندگی سے محروم ہو جاتی ہیں۔"

اقبال زمین سے نفرت نہیں کرتا، وہ نہ صرف زمین پر تلاشِ معاش کے صحیح اُصول بتاتا ہے بلکہ جنتِ ارضی کی ایسی تشکیل چاہتا ہے جہاں سب انسانوں کی حاجتیں پوری ہوں۔ رہا یہ سوال کہ فرد جبلت میں گرفتار ہوکر اپنی لاہوتیت کو بیٹھتا ہے تو اس میں کوئی شک ہی نہیں ہے کیونکہ انسان پاؤں کی بجائے سر کے بل زمین پر چلنا شروع کردے تو انجام ظاہر ہے۔ ضروری ہے کہ انسان کا سر اونچا ہی رہے۔

سلیم احمد کہتے ہیں۔ "بہر حال اقبال کا شاہین زمین پر نہیں اترتا۔ اقبال ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ وہ کھاتا کیا ہے۔؟" ڈاکٹر انیسؔ ناگی نے سلیم احمد کو جواب دیا۔ وہ کہتے ہیں۔ "مجھے شاہین کی خوراک اور اس کے مینو سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" [۱۳] سلیم احمد نے "اقبال۔ ایک شاعر" کی اشاعت ثانی (۱۹۸۷ء) میں ڈاکٹر انیس ناگی کو جواب الجواب یُوں دیا ہے۔ "زندہ شاہین اگر رکھنا ہے تو اس کے مینو سے بھی دلچسپی رکھنی پڑے گی ورنہ مر جائے گا۔ ہاں مگر "ڈمی شاہین" کی اور بات ہے۔"

لگتا ہے دونوں اقبال شناس لفظوں کو چاندی ماری پر اُتر آئے ہیں۔ اگر سلیم احمد کی خواہش کے مطابق شاہین کا مینو طے بھی ہو جائے تو اُن کا اگلا سوال شاہین کی رہائش کے بارے میں

ہوگا حالانکہ یہ بات ادب کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ علامت تو علامت ہوتی ہے۔ کسی بہادر شخص کے لئے اگر "شیر" کی علامت تراشی جائے تو کھانے پینے کی مماثلتوں کے علاوہ کیا یہ ضروری ہے کہ بہادر شخص کے دُم بھی ہو؟ بہر حال سلیم اس بات پر مُصر ہیں۔" مگر وہ پرواز جو رزق کے بغیر ہو، کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی۔ رزق ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے اور انسان خیر الرّازقین کی پرستش کرتا ہے لیکن اقبال کے شاہین ابھی اس سوچ میں ہیں کہ انہیں رزق کے لئے زمین پر اُترنا ہے یا نہیں؟"

"اقبال۔ ایک شاعر" میں سلیم احمد نے جگہ جگہ اختلافی سوالات اٹھائے ہیں۔ مثلاً کتاب کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کو اب تک اُردو یا فارسی کے بڑے شعراء کے ساتھ رکھ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ سلیم احمد کی زندگی ہی میں وزیر الحسن عابدی اور مرزا محمد منور ایسی کامیاب کوششیں کر چکے تھے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے۔" سلیم احمد جب شاعر اقبال کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ انسان بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ مرد اقبال کا مطالعہ بن جاتا ہے اور یوں وہ نفسیات کی قلمرو میں جا داخل ہوتا ہے اور یہ کام آسان نہیں۔"[۱۴]

"اقبال۔ ایک شاعر" میں سلیم احمد کی ذات اور تنقیدی بصیرت پر بہت سے اعتراضات کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر نجم الاسلام نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے۔" اقبالیات کی تشکیلِ جدید تو اور بھی مشکل کام ہے جسے سر کرنے کی صلاحیت اور تربیت سلیم احمد نے پائی ہی نہیں تھی۔ وہ پتا ماری کے کاموں کی طرف کم ہی آئے۔ ساری توانائی تو مجلسی حُسنِ کلام ہی میں صرف ہو کر رہ گئی باقی وقت شاعری، ڈرامہ نگاری اور کالم نگاری میں ۔۔۔ بے شک اس میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔"[۱۵]

کیا سلیم احمد کا مجلسی حُسنِ کلام، ڈرامہ نگاری اور شاعری اُن کے تنقید لکھنے میں مانع تھی؟ ایسا نہیں ہے بلکہ سلیم احمد کی سب سے نمایاں حیثیت تو ایک تنقید نگار ہی کی ہے اور تنقید بھی ایسی جو حوالوں کی بھرمار اور چبائے ہوئے نوالوں کی جگالی کرنے کی بجائے زیادہ تخلیقی نوعیت کی ہے۔

"اقبال ۔ ایک شاعر" کی اشاعتِ ثانی میں سلیم احمد نے اکثر و بیشتر معترضین کے مدلّل جوابات دیئے ہیں ۔ اس سے اُن کے موضوع میں مزید وسعت اور گہرائی پیدا ہوگئی ہے تاہم اختلاف کی گنجائش تو ہر جگہ موجود رہتی ہے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں ۔ "اوّل تو میری کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں میں یہ دعویٰ کرسکوں کہ اس میں مجھے جو کہنا تھا وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے ۔ بہرحال بے عیب تو صرف خُدا کی ذات ہے اور کتاب اللہ کے سوا اور کس کتاب کو حرفِ آخر کہا جاسکتا ہے ۔"

اقبال سے اختلاف کرنا اگر کوئی جُرم ہے تو یہ جُرم سلیم احمد سے پہلے مولانا اکبرالہ آبادی، مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، خواجہ حسن نظامی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی کر چکے ہیں ۔ خود اقبال نے بھی بڑے بڑے سکّہ بند بزرگوں سے اختلاف کیا ہے ۔

سلیم احمد کے خیال میں فکرِ اقبال کی تنقید ملّت کی صحت کے لئے ضروری ہے ۔ اختلاف کو اختلاف ہی رہنا چاہیے اور اختلاف ہی سمجھنا چاہیے ۔ اسے مخالفت اور ذاتی دشمنی پر محمول کرنا ایک طرح کی کج فکری ہے ۔

سلیم احمد ایک خط میں لکھتے ہیں ۔ "اقبال سے میری لڑائی میرے عشق کا نتیجہ ہے ۔ اس تعلق کو اقبال کے مجاور اور تاجر نہیں سمجھ سکتے ۔ کاش پاکستان کا ماحول ایسا ہوتا کہ اقبال اور اسلام سستی نعرہ بازی کا شکار ہو کر نہ رہ جاتے ۔"[۱۶]

۵۔ محمد حسن عسکری

"محمد حسن عسکری، آدمی یا انسان" میں بھی سلیم احمد نے زیرِ بحث شخصیت کا مرکزی مسئلہ دریافت کر کے اس پر اپنے تمام مضامین کی بنیاد رکھی ہے ۔ "ابتدائیہ" کے علاوہ گیارہ ابواب اور دو ضمیموں میں ساری بحث کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ "میں عسکری صاحب کو جاننے کا دعویٰ کیسے کروں؟ میں عسکری صاحب پر کچھ کہتا ہوں تو اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ عسکری صاحب نے میرے جیسے چھوٹے آدمی میں بھی وہ خود اعتمادی پیدا کی جس کے بغیر میں کچھ لکھتا تو کیا، زندہ بھی نہیں رہ سکتا تھا ۔"[۱۷]

سلیم احمد نے عسکری کی شخصیت کو "روحانی سفر کا استعارہ" کہا ہے لیکن عسکری کے کچھ دیگر ناقدین کا خیال ہے کہ وہ اپنی عمر کے آخری دس پندرہ برسوں میں روحانی سفر کا استعارہ بنے تھے۔ اس سے پہلے وہ مختلف اور متضاد راہوں پر گامزن رہے۔ عسکری کا اِدھر ڈوب کر اُدھر نکلنا اُن کے اکثر ناقدین کی سمجھ میں نہ آیا۔

شمیم احمد سے لے کر محمد علی صدیقی تک تقریباً سبھی ناقدین عسکری کی پروازوں کو حیرت اور استعجاب کے دیکھتے رہے اور سمجھ سمجھ کر کچھ نہ سمجھنے کا دھوکہ کھاتے رہے۔ ایسے میں عسکری کے کے دو نامور جانشینوں سلیم احمد اور مظفر علی سیّد نے کسی حد تک عسکری کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں سلیم احمد عسکری کے بنیادی مضمون "انسان اور آدمی" سے مطالعہ کا آغاز کیا ہے۔ سلیم احمد کہتے ہیں۔ "اگر عسکری کی تمام تحریریں کسی وجہ سے تلف ہو جائیں اور صرف یہی مضمون باقی رہے تو اس کی مدد سے اُن کے پورے نقطۂ نظر کو دوبارہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔"[۱۸]

سلیم احمد پہلے اوسپنسکی کی تعریف کے مطابق آدمی اور انسان کا مفہوم واضح کرتے ہیں۔ جسے اوسپنسکی نے بالترتیب جوہر اور شخصیت کہا ہے۔

سلیم احمد کا خیال ہے کہ "آدمی" کی تمام ترحمایت کے باوجود عسکری خود ایک عام آدمی نہیں تھے۔ اُن کا خیال ہے کہ اگرچہ عسکری میں ذہنی، جبلی اور حیاتیاتی آدمی موجود تھا لیکن اس کے باوجود، "عسکری صاحب انسان تھے بلکہ خاص الخاص انسان وہ آدمی ہوتے یا عام آدمی ہوتے تو عسکری نہ ہوتے، ادیب نہ ہوتے۔"[۱۹]

یہ بات تعجب انگیز ہے کہ حسن عسکری بہت بڑے افسانہ نگار ہونے کے باوجود اپنے آخری دور میں اپنی افسانہ نگار کی حیثیت کو مانتے (OWN) نہیں تھے۔ اس موقع پر سلیم احمد پروفیسر کرّار حسین کا ایک قول نقل کرتے ہیں۔ "میں نے اپنی آدھی زندگی ایک خاص آدمی بننے کی کوشش میں

بسر کی اور باقی آدھی زندگی ایک عام آدمی بننے میں۔ اب خدا سے دعا کرتا ہوں کہ کم از کم آدمی تو بن جاؤں۔"

سلیم احمد کا خیال ہے کہ عسکری صاحب ایک خاص آدمی تھے اور عام آدمی بننا چاہتے تھے۔ ان کی یہی کشمکش ان کی روح کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس مضمون میں سلیم احمد نے بودیلئر، فلابیر، جمیس جوائس اور لارنس کے ہاں آدمی اور انسان کے تصورات سے بحث کرتے ہوئے عسکری کے مسئلے یعنی "انسان اور آدمی کی جنگ" کو سمجھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے دوسرے باب میں سلیم احمد نے میرؔ و غالبؔ کے تقابل سے حسن عسکری کے "تصورِ آدمی و انسان" کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

عسکری صاحب کا خیال ہے کہ میرؔ جدیدیت کے سفر میں اثبات کی منزل تک پہنچتا ہے جبکہ غالبؔ انکار پہ آ کے رُک جاتا ہے۔ سلیم احمد کا خیال ہے کہ عسکری بھی میرؔ کی طرح انکار سے اثبات تک پہنچے ہیں۔ وہ آخر میں سوال اٹھاتے ہیں۔ " کیا اُردو کا کوئی دوسرا ادیب یہاں تک پہنچنا تو درکنار پہنچنے کا کوئی تصور بھی رکھتا ہے۔"

تیسرے باب میں سلیم احمد نے مطالعہ حالی کے ذریعے حسن عسکری کی شخصیت اور افکار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ حالیؔ کے اس مطالعہ سے عسکری کی تفہیم میں کیا مدد ملتی ہے؟ سلیم احمد کا خیال ہے کہ عسکری نے حالیؔ پر جو لکھا وہ عسکری ہوئے بغیر نہیں لکھا جا سکتا تھا؟ عسکریؔ ایک سچی شخصیت تھے اور حالیؔ سے زیادہ جانتے تھے کہ سچی شخصیت کیسے بنتی ہے؟ اور اس کے کیا تقاضے ہوتے ہیں؟

چوتھے باب میں سلیم احمد نے حسن عسکری کے "آدمی اور انسان" کو فراقؔ گورکھپوری کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ عسکری صاحب میرؔ کے بعد فراق کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس کی وجوہ کیا ہیں؟ یہ بتانے کے لئے سلیم احمد نے ایک لمبا چکّر کاٹا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حسن عسکری فراقؔ گورکھپوری کو بھی اسی لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ دو انتہاؤں کو باہم دگر مربوط کر دیتا ہے

۔فراق کی شاعری ان دونوں کائناتی رشتوں کے تال میل سے جنم لیتی ہے بلکہ بعض اوقات تو عسکری فراق کو میر سے بھی بڑا شاعر قرار دیتے ہیں۔

پانچویں باب میں سلیم احمد نے پہلے تو اپنے سابقہ مضامین کا ذکر کیا ہے کہ ان مضامین میں عسکری صاحب کا ایک نیا تنقیدی وژن سامنے آیا ہے۔ پھر انہوں نے اُردو تنقید کی موجودہ صورت حال پر عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "اُردو تنقید اندھوں کی دُنیا ہے لیکن فراق اور عسکری کا معاملہ جدا ہے۔ وہ اُردو تنقید کے پہلے دیکھنے والے ہیں۔"[۲۱]

سلیم احمد کا خیال ہے کہ عسکری رینے گینوں تک بھی اپنی آگہی کے ذریعے پہنچے۔ اُنہوں نے بہت پہلے اُردو کے ادیبوں سے کہہ دیا تھا۔ "دُنیائے ادب میں جگہ بنانی ہے تو دنیا ہم سے وہ مانگے گی جو صرف ایک ہندوستانی ہی دے سکتا ہے۔"

سلیم احمد اس کی تعبیر یُوں کرتے ہیں کہ یہ ہندوستان کیا ہے؟ یہ مشرق ہے۔ جو ماورائے عصر ہے۔ گویا عسکری نے جو بعد میں دریافت کیا وہ ان کی اوّلین دریافتوں ہی کی صدائے بازگشت ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ عسکری کے اکثر پیروکار مثلاً مظفر علی سیّد، عسکری کے ذہنی سفر کو ایک خطِ مستقیم یا اِرتقائی خط کی شکل میں دیکھنے کی بجائے ایک دائرے کی شکل میں دیکھتے ہیں لیکن دائرے کا یہ "چکّر" یا معمہ کسی سے حل نہیں ہوتا۔ مثلاً محمد علی صدیقی کہتے ہیں۔ "محمد حسن عسکری نے اپنا سفر کمٹ منٹ سے شروع کیا پھر "پھسلن" (۱۹۴۰ء) کے بعد کمٹ منٹ سے انحراف کی منزل شروع ہوئی اور اس کے بعد وہ اپنی عمر کے آخری حصّہ میں دوبارہ کٹ منٹ کی جانب پلٹے۔ پہیہ کا چکّر پورا ہوا۔ ان کا ذہنی سفر کچھ یُوں ہے کہ ان کے بہت سے ہمعصروں کے لئے معمہ ہے۔"[۲۲]

چھٹے باب میں سلیم احمد نے عسکری کے مضمون "انسان اور آدمی" (۱۹۴۸ء) کے حوالے سے عسکری کے شعور کی مختلف منزلیں واضح کی ہیں۔ اسی مضمون میں عسکری نے اسلام کا پہلو اس قدر اچانک بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ سلیم احمد کا خیال ہے کہ اسلام کا یہ ذکر ادبی حوالے سے کچھ غیر متعلق سا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر عسکری صاحب کی بقیہ زندگی کو دیکھا جائے تو

اسلام کا یہ ذکر ہی سب کچھ لگتا ہے۔

محسن کارکوری کی نعتیہ شاعری پر ۱۹۵۹ء میں لکھا ہوا مضمون عسکری کی اگلی منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔ عسکری "آدمی اور انسان" میں جس مسئلے سے اُلجھے ہوئے تھے، اس کا جواب انہیں تین سال بعد محسن کارکوری کی شاعری پر مضمون لکھتے ہوئے ملا۔

"آدمی اور انسان" میں عسکری صاحب کا مسئلہ تھا ایک نیا تصور انسان۔ محسن پر لکھے گئے مضمون میں انہوں نے دیکھا کہ نبی اکرمؐ بھی ایک انسان ہیں۔ انہوں نے محسن کاکوروی کی شاعری میں آنحضورؐ کو بحیثیت انسان دیکھا جب کہ اس سے پہلے خصوصاً حالی وغیرہ کے ہاں نعت گوئی میں "انسانی خوبیوں" کا بہی کھاتہ نظر آتا ہے۔

کتاب کے نویں باب میں وہ ہمارے سامنے معروضی صورت حال پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مشرق و مغرب کی آویزش میں ہمارے سامنے تین گروہ آتے ہیں۔

۱۔ ایک گروہ پیروی مغربی کا قائل ہے جو ایک خطرناک بات ہے۔

۲۔ دوسرا گروہ مشرقی روح کا علمبردار ہے جو فی الحال ناممکن ہے۔

۳۔ تیسرا گروہ پہلے دونوں گروہوں کا امتزاج ہے یہ گروہ سب سے زیادہ غلطی پر ہے کیونکہ امتزاج تو دو ایسی چیزوں کا ہو سکتا ہے جن میں کچھ اجزاء مشترک ہوں جبکہ مشرق و مغرب تو دو متضاد چیزیں ہیں۔

عسکری صاحب نے اپنے مضمون میں ان تینوں سوالوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے انہوں نے ایسی باتیں کہی ہیں جو صرف وہی کہہ سکتے تھے۔ عسکری صاحب کے بقول "اگر ہم نے مغربی ادب کے موجودہ اور غالب رجحانات کی پیروی کی تو ہم زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکیں گے کہ مغرب جیسا ادب پیدا کر چکا ہے اس کی ایک نقل ہم بھی تیار کر دیں۔"۲۳

اب سوال پھر وہیں کا وہیں ہے یعنی ہم کیا کریں؟ اب ہماری مجموعی صورت حال یہ ہے۔

۱۔ ہم مغربی نہیں اور مغربی ادب پیدا کریں تو انجام موت ہے۔

۲۔ مشرق کی طرف لوٹنے کی کوشش کریں تو راستہ بند ہے۔

۳۔ امتزاج ہو نہیں سکتا۔۔۔۔ تو پھر آخر کیا کریں؟

سلیم احمد کہتے ہیں کہ میں نے یہ سوال عسکری صاحب سے اُن کی زندگی ہی میں پوچھا تھا۔ انہوں نے تحریری سوال کا جواب تو نہیں دیا لیکن زبانی طور پر کہا "نماز پڑھا کرو" سلیم احمد کو تشویش ہے کہ نجانے ہماری نماز بھی ٹھیک ہوتی ہے یا نہیں۔

عسکری کے خیال میں چینی، ہندو اور اسلامی تہذیبیں مشرق کی عظیم ترین روایتی تہذیبیں ہیں جبکہ یونانی، عیسائی اور یہودی نامکمل روایتی تہذیبیں ہیں۔ ان کے مقابلے پر مغرب کی جدید تہذیب مکمل طور پر ایک غیر روایتی تہذیب ہے۔ پہلی تہذیبیں "حقیقت" کا مشترکہ تصور رکھنے کی وجہ سے روایتی تھیں۔

عسکری صاحب کی کتاب "جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کا خاکہ" (۱۹۷۹ء) مرحوم کی وفات (۱۹۷۸ء) کے بعد شائع ہوئی۔ جس سے بحث مباحثے کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا۔ عسکری کے معترضین میں محمد ارشاد نامی ایک نو وارد دانشور کو "فنون" کے صفحات میں بہت پذیرائی ملی۔ محمد ارشاد اس بحث میں پہلے اور بعد علمی و ادبی دنیا میں کم ہی نظر آئے جس سے کچھ لوگوں کو شک گزرا کہ کہیں یہ نام فرضی نہ ہو۔

ادبی مجلّہ "فنون" نے عسکری کے تصورِ روایت اور جدیدیت پر فکر انگیز تحقیقی مضامین شائع کیے۔ مگر عسکری صاحب کی حمایت میں لکھنے والوں کی تحریریں زیادہ شائع نہ ہو سکیں۔ اس معاملے میں جدیدیت کے حامیوں کا نقطہ نظر یہ رہا ہے کہ اگر جدید تہذیب (غیر روایتی ہی سہی) کو قبول نہ کیا جائے تو کیا موجودہ علوم و فنون اور سائنس اور ٹیکنالوجی کا سارا سرمایہ دریا بُرد کرنا پڑے گا۔ جدیدیت اور ترقی پسندی کے ان حامیوں کے نزدیک روایت کے علمبردار انسان کی مادی ترقی کے خلاف ہیں۔

آخر میں سلیم احمد اپنے مطالعہ عسکری کا نچوڑ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

شریعت ہے جسم (عام آدمی) اور طریقت کا روح (خاص آدمی یا انسان) ہے۔ عسکری صاحب عام آدمیوں کو بہت پسند کرتے تھے، جس کے ادب میں وہ میرؔ اور جوائس کے قائل ہیں۔ اسی طرح مذہب میں وہ شریعت پر زور دیتے ہیں۔ اِس طرح انہوں نے عام آدمی کو بھی پالیا اور اپنے جوہر کو بھی۔

سلیم احمد کا خیال ہے کہ خاکہ نگاری میں عسکری صاحب کی ناکامی ان کی شخصیت کے ایک گہرے المیئے سے پیدا ہوئی ہے۔ عسکری جذبات کے اظہار سے ڈرتے تھے بلکہ شاید یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان میں جذبات جیسی کوئی شے موجود تھی۔ "وہ ان جذبات کے اظہار کو ایک عامیانہ بات سمجھتے تھے۔ وہ انہیں ایسے چھپاتے تھے جیسے لوگ اپنی کسی کمزوری کو چھپاتے ہیں۔ ایک ایسے سپاہی کی طرح جو زخموں سے چور ہو مگر اپنے زخم کسی کو دکھانا نہ چاہتا ہو۔"

سلیم احمد نے عمر کے آخری حصے میں عسکری سے دُور رہ کر بھی عسکری کے اثرات کا جائزہ لیا اس طرح یہ کتاب اپنے موضوع کی مناسبت سے ممکنہ حد تک جامع اور مستند کہی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود سلیم احمد کی تمنا تھی "ہمیں پورا عسکری چاہیے۔"

۲۔ ہمعصر شخصیات

سلیم احمد کی ایک "ادھوری" تنقیدی کتاب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ یہ جوشؔ ملیح آبادی پر لکھے گئے مضامین کا ایک سلسلہ ہے۔ "جوش اور خُدا" میں مصنف نے خُدا کو جوش کا بنیادی مسئلہ قرار دیا ہے بنیادی مسئلہ دریافت کر کے تنقیدی جائزہ لینا، سلیم احمد کی تنقید کا خاص وصف ہے۔

سلیم احمد کہتے ہیں، چونکہ جوشؔ کی شخصیت کے تضادات دراصل کائنات کے تضادات ہیں اسی لئے جوش نے اپنے شعری مجموعوں کے نام بھی متضاد جوڑوں پر رکھے مثلاً شعلہ و شبنم، جلال و جمال وغیرہ۔

"جوش اور آدمی" میں سلیم احمد نے جوش کے تصور اِنسان سے بحث کی ہے۔ جوشؔ کا آدمی یا انسان ہند اسلامی عجمی تہذیب اور مغربی تہذیب کے ملاپ سے پیدا ہوا ہے۔

جہاں تک جوشؔ کی انسان پرستی کا سوال ہے تو اس میں بھی ان کا کوئی خاص کمال نہیں ہے کیونکہ انسان کی عظمت تو ہر تہذیب نے تسلیم کی ہے۔ سلیم احمد کہتے ہیں کہ ہماری روایتی تہذیب

(اسلام) نے تو انسان کو خلیفۃ اللہ کا منصب عطا کیا ہے لیکن جوشؔ نے انسان کو "پڑھو کلمہ لا الہ الا انسان" کہہ کر اپنے تئیں بہت بڑھایا ہے۔

سلیم احمد کے نزدیک جوش کا نظریہ فن یہ ہے کہ شاعر کے جذبات سریع الا اشتعال ہونے چاہییں جبکہ سلیم احمد جذبات کی بجائے جذبات کی باز آفرینی کو شاعری کے لئے زیادہ ضروری خیال کرتے ہیں نیز اُن کے نزدیک جذبہ اور تخلیقی جذبہ میں بھی فرق ہے چنانچہ جوش کی شاعری اس شعر کی تفسیر ہو کر رہ گئی ہے۔

گاڑی میں گنگناتا مسرور جا رہا تھا اجمیر کی طرف سے جے پور جا رہا تھا۔[۲۴]

"جوش پہلی ہی نظم میں ڈکشنری مرتب کر چکے ہیں منظم ڈکشنری بھی کیا بُری ہے۔"

ہمعصر شخصیات کے حوالے سے لکھے گئے تنقیدی مضامین میں سلیم احمد کے وہ مضامین بھی شامل کئے جا سکتے ہیں جو انہوں نے ہمعصروں کے علاوہ کچھ بزرگ ہستیوں یا نوجوانوں کے بارے میں لکھے۔ بزرگوں میں ایک اہم نام بابا ذہین شاہ تاجیؔ کا بھی ہے۔ سلیم احمد نے بابا جی کے "ترجمۂ فصوص الحکم" کا پیش لفظ اور مجموعہ کلام "آیاتِ جمال" کا دیپاچہ لکھا۔ ظاہر ہے یہ دونوں پیش لفظ یا مضامین عقیدت کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔

نام کے ہر حصے اور پھر کتاب کے عنوان کے اعداد کا مجموعہ نو ہے۔ سلیم احمد کا خیال ہے کہ یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ "نو کا عدد حقیقت محمدیؐ کی طرف شارہ کرتا ہے۔"۔۔۔"اس دور کی شاعری میں "آیاتِ جمال" کی وہی اہمیت ہے جو اس دور کی سیاست میں قرار داد مقاصد کی ہے۔"

علامہ سلیمان ندوی، عشق اور معاشرہ" سلیم احمد کا ایک عمدہ تنقیدی مضمون ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں بڑے اختصار سے میرؔ سے فراقؔ تک مختلف شعراء کے ہاں عشقیہ رویوں کا جائزہ لینے کے بعد عشق کی تعریف یوں متعیّن کی ہے۔ "جنسی جذبات کی عمومیت تخصیص میں بدل جاتی ہے تو عشق کہلاتی ہے۔"[۲۵]

عزیز حامد مدنیؔ کی شاعری پر سلیم احمد کا مضمون "بڑے شہر کا شاعر" بھی "چیزے لے دیگر" ہے

مضمون کا آغاز بہت ڈرامائی ہے۔ "اُس روز ہماری گفتگو بہت دُور نکل گئی۔" آگے چل کر سلیم احمد نے سوال اُٹھایا کہ ہماری سوسائٹی، زر پرست سوسائٹی میں آرٹسٹ کا کیا مقام ہے؟ نیز یہ کہ آرٹسٹ ہوتا کون ہے؟

ہمعصر شخصیات میں سے ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر نظیر صدیقی کے مختلف مضامین کے جواب میں بھی سلیم احمد نے کچھ مضامین لکھے۔ ان مضامین میں جہاں موضوع کی مناسبت سے سلیم احمد نے علمی نکات بیان کئے ہیں وہاں اپنے مخصوص انداز میں طنز و تعریض سے بھی کام لیا ہے۔

مثلاً "اظہار و ابلاغ" کے حوالے سے نظیر صدیقی کے اُٹھائے ہوئے سوالات کے ترُکی بہ ترُکی جوابات یوں دیتے ہیں۔

نظیر صدیقی	سلیم احمد
ا۔شاعری کی بنیادی صفت تاثیر ہے۔	ا۔شاعری کی بنیادی صفت تاثیر نہیں ہے۔
۲۔شاعری موسیقی نہیں ہے۔	۲۔شاعری موسیقی بھی ہے۔
۳۔شاعری ریاضیات نہیں ہے۔	۳۔شاعری ریاضیات بھی ہے۔
۴۔شاعری علمیت کی چیز نہیں ہے۔	۴۔تصوف کی شاعری دنیا کی عظیم ترین شاعری ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے بھی سلیم احمد کا علمی و ادبی تعلق رہا۔ جب "اظہار و ابلاغ" کی بحث شروع ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے مضمون "ابلاغ سے علامت تک" لکھا۔ اس کے جواب میں سلیم احمد نے "ابلاغ کا مسئلہ" کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس مضمون کا انداز نظیر صدیقی کے جواب میں لکھے گئے مضمون سے مختلف ہے۔ اس میں سلیم احمد کا لہجہ معتدل ہے اور وہ بار بار "آغا صاحب، آغا صاحب" کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں لیکن اس اعتدال کی کمی اُس مضمون میں زیادہ محسوس کی گئی ہے جو انہوں نے آغا صاحب کی کتاب "اُردو شاعری کا مزاج" پر لکھا۔ "ارضی تہذیب کا انجام" کے عنوان سے لکھا گیا یہ مضمون بھی خاصا جارحانہ ہے۔

"اظہار و ابلاغ" ہی کی بحث کے ضمن میں سلیم احمد نے ایک مضمون " فکر کا طاعون " شمس الرحمٰن فاروقی کے جواب میں بھی لکھا۔ یہ فاروقی صاحب کے مضمون "ترسیل کی ناکافی" کا جواب ہے۔ ممتاز حسین سلیم احمد کے ایک ایسے ہمعصر ہیں جن کے حوالے سلیم احمد کے تنقیدی مضامین میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ کہیں براہِ راست اُن کی باتوں کا جواب دیا ہے اور کہیں بالواسطہ۔

ہمعصروں کے مقابلے پر برخورداروں اور جونیئر ادیبوں کے حوالوں سے لکھے گئے مضامین میں سلیم احمد نے حوصلہ افزائی کا انداز اختیار کیا ہے۔ ایسے مضامین زیادہ تر فلیپ یا دیباچوں کی صورت میں ہیں اور نظم و نثر دونوں اصناف کے لئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم نام عبداللہ علیم کا ہے۔ علیم کے شعری مجموعہ "چاند چہرہ ستارہ آنکھیں" کا فلیپ سلیم احمد نے لکھا۔ انہوں نے علیم کے سینے کی آگ کو غالبؔ بلکہ آتشکدہ فارس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ سلیم احمد نے لفظوں کی ایک اور طوطا مینا صلاح الدین پرویزؔ کے ناول "سارے دن کا تھکا ہوا پرش" کا پیش لفظ لکھتے ہوئے بھی بنائی ہے۔ سلیم احمد کی یہ وہ کمزور تحریریں ہیں جن پر بعدازاں مرحوم خود بھی پشیمان رہے۔

سلیم احمد نے جاذبؔ قریشی کے شعری مجموعہ "پہچان" کا دیباچہ "شہر ماتم بلا اور آئینہ" کے عنوان سے لکھا اور خُوب لکھا۔ ایک عرصہ تک سلیم احمد کی شبانہ محفلوں کے ایک حاضر باش شاگرد، جاذبؔ قریشی کا یہ حق بھی تھا اور سعادت بھی۔ نوجوان ڈاکٹر آصف اسلم فرخی نے ایک انگریزی ناول "سدھارتھ" کا ترجمہ کیا۔ انہوں نے "انکل سلیم" سے اس کتاب کے حوالے سے خصوصی انٹرویو کیا۔ جس میں اِس نوجوان لکھنے والے عزیز کی بھرپور حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ سلیم احمد نے قابل قدر خیالات کا اظہار کیا۔ چونکہ سلیم احمد نے زیادہ تر شاعری کی تنقید لکھی یا تنقید کی تنقید، اس لئے اُن کا یہ مکالمہ فکشن کی تنقید کے حوالے سے ایک اہم تحریر ہے۔ انہوں نے کہا۔ "میں تو اس ناول کو اس صدی کی بہت اہم فکری اور فنی دستاویز سمجھتا ہوں۔۔۔ میں نے اس ناول کو نجانے کتنی بار پڑھا ہے۔ میں نے تمہارا ترجمہ پڑھا۔ مجھے پسند آیا۔ تم اس کتاب کو گرفت میں لے آئے ہو۔"[۲۶]

ڈاکٹر سلیم اختر کی ایک کتاب کا فلیپ بھی خصوصی ذکر چاہتا ہے۔ سلیم احمد نے لکھا ہے۔"ڈاکٹر سلیم اختر کی کوششیں اِس اعتبار سے انتہائی وقیع اور قابلِ توجہ ہیں کہ انہوں نے پہلی بار باقاعدگی کے ساتھ نفسیاتی نظریوں کو تنقیدی مطالعہ کی بنیاد بنایا ہے۔"۲۷

سلیم احمد کی اس رائے کے برعکس ڈاکٹر سلیم اختر کی وہ رائے بھی پیش نظر رہنی چاہیے جو انہوں نے اپنی مقبول کتاب "اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" میں لکھی ہے۔۔۔۔"سلیم احمد ان ناقدین میں سے ہیں جو نزاعات پر پنپتے ہیں۔"۔۔۔۔"جب "بیاض" کا مطالعہ کریں تو اچھی شاعری کے باوجود مایوسی ہوتی ہے۔"مذکورہ بالا آراء کی موجودگی کے باوجود سلیم احمد کا ڈاکٹر سلیم اختر کے بارے میں حوصلہ افزاء فلیپ لکھنا، سلیم احمد کی عالی ظرفی بلکہ شاہ خرچی کی ایک اور دلیل ہے۔

کتابی تبصروں کے حوالے سے "اقبال کا نظریہ ثقافت" نامی کتاب پر سلیم احمد کا تبصرہ محض ایک عمومی تبصرہ نہیں ہے۔اس میں سلیم احمد کی تنقید کے تمام اہم اوصاف یعنی علمیت، سنجیدگی اور شگفتگی پائے جاتے ہیں۔اسی طرح "قرآن مجید، اسلامی فکر کا بنیادی سرچشمہ" کے عنوان سے مجموعہء مقالات پر سلیم احمد کا تبصرہ پڑھ کر اُن کی وافر دینی معلومات اور مختلف زبانوں خصوصاً انگریزی اور عربی پر اُن کی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔

۷۔ ادبی مسائل

خالص ادبی موضوعات میں سب سے پہلے سلیم احمد کا مضمون "اُردو غزل" آتا ہے جو ۱۹۵۴ء میں لکھا گیا۔ "اُردو غزل" میں سلیم احمد نے ایک بنیادی سوال اٹھایا ہے یعنی کیا اُردو غزل، فارسی غزل سے مختلف ہے؟ نیز یہ کیوں اور کیسے مختلف ہے؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوا کہ بعض مستند اربابِ تحقیق اکثر و بیشتر یہ کہتے رہے ہیں کہ اُردو غزل، فارسی غزل کا چربہ یا نقالی ہے۔ تشبیہیں اور استعارے، رموز اور علامتیں، اسالیب اور طرزِ بیاں تو رہے ایک طرف، خیالات، جذبات اور محسوسات تک مستعار ہیں۔

سلیم احمد کا مطالعہ اور تجربہ یہ کہ اُردو غزل نے فارسی غزل کے مقابلے پر جذبہ عشق (یا جنس) کی

تہذیب کی ہے۔ زندگی کی ضرورتوں اور "نون تیل لکڑی" کے مسائل کو ساتھ لے کر اُردو غزل گوؤں نے جنسی جذبے کو ترفع بخشا ہے۔

"جدید غزل" میں محبوب کے تصور کا مطالعہ کرتے ہوئے سلیم احمد نے میر تقی میر سے عہدِ حاضر تک کے بھی قابلِ ذکر شعراء کے حوالے دیئے ہیں۔ سلیم احمد کہتے ہیں۔ "غزل کے معنی اگر عورتوں کے متعلق یا عورتوں سے باتیں کرنا ہے تو جدید غزل کو پڑھنے کے لئے قانونی، اخلاقی اور شرعی قباحتوں کے باوجود، جدید عورتوں کو ذرا غور سے دیکھنا ضروری ہے۔"

جدید عورت کی کھوج میں نکلتے ہوئے سلیم احمد نے فتح محمد ملک کے خیال سے اتفاق کیا ہے اور ڈپٹی نذیر احمد کی "تمیز دار بہو"[۲۹] کو جدید عورت کی نانی قرار دیا ہے۔ بقول سلیم احمد "جدید عورت کی اماں حوا یوں تو ڈپٹی نذیر احمد کی "تمیز دار بہو" ہے لیکن غزل کی روایت میں جدید عورت کی جھلکیاں ہمیں سب سے پہلے حسرت کی غزل میں ملتی ہیں۔ مومن کے پردہ نشیں محبوبوں سے ایک گونہ مماثلت رکھنے کے باوجود حسرت کا محبوب ان سب سے مختلف ہے۔

یگانہ کے بارے میں سلیم احمد کا خیال ہے کہ برِصغیر میں بیسویں صدی کی زندگی کے اہم گوشہ کی تفہیم یگانہ کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اختر شیرانی کا بیشتر کلام چونکہ نظموں پر مشتمل ہے اس لئے سلیم احمد اختر کو چھوڑ کر فیض کی طرف آتے ہیں۔ فیض کے ہاں ہمیں حسن کا جو پرتو نظر آتا ہے وہ مغربی طرز کی بے حد جدید عورت ہے۔ فیض اس کی نفسیات کے بارے میں تو کچھ نہیں بتاتے لیکن اتنا ضرور بتاتے ہیں کہ وہ ڈرائنگ روم کی مخلوق ہے۔

محولہ بالا شعراء کی شاعری کو پس منظر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے سلیم احمد اب پیش منظر پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے اب حسرت اور فراق کا محبوب اُردو غزل میں عام ہوگیا ہے۔ یہ ایک بڑی معاشرتی تبدیلی کا مظہر ہے۔ ایسا محبوب بقول سلیم احمد "زمانے کی دین" ہے۔ "آپ دیکھیں گے کہ زمانے کی اس دین سے اپنے اپنے دستِ رسا کے مطابق سب ہی فیض یاب ہوئے ہیں۔ اس محبوب کی صفت صرف یہ نہیں کہ آدمی ہے بلکہ اسے دیکھنے کی تاب بھی لائی جاسکتی ہے۔

صرف دیکھنے کی نہیں ساتھ سلانے کی بھی۔"۳۰؎

"جدید غزل" کے حوالے سے سلیم احمد کے خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے فتح محمد ملک نے کہا ہے۔ "غزل کی بیخ کنی کرنے والوں میں پُرانے زمانے کے برافروختہ نوجوان نیازؔ فتح پوری بھی شامل ہیں اور نئے زمانے کے برافروختہ نوجوان اور نیازؔ کے سخت گیر نقاد) سلیم احمد بھی۔ چلئے کوئی مسئلہ تو ایسا نکل آیا۔ جہاں پر ہماری ادبی روایت کے باغی اور مقلد ہر دو متفق علیہ ہیں۔"۳۱؎

سلیم احمد نے شاعری کی تنقید لکھتے ہوئے جہاں غزل پر اہم مضامین لکھے وہیں ایک اور اہم صنف شعر یعنی "نظم" خصوصاً نئی نظم کو بھی موضوعِ تنقید بنایا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کا ایک مشہور مضمون "نئی نظم اور پورا آدمی" ہے۔ جدید غزل اور جدید نظم پر لکھے گئے سلیم احمد کے ان دونوں مضامین کو ملا کر دیکھنے سے اُن کے خیالات کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

"نئی نظم اور پورا آدمی" کے عنوان سے سلیم احمد کا یہ مضمون ۸۰ صفحات پر محیط ہے۔ اس کا تنقیدی جائزہ لیا جانا چاہیے لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ سلیم احمد کے پورے آدمی سے واقفیت حاصل کر لی جائے۔ عالمی ادب میں یہ تصور چاہے جہاں بھی ہو اور جس نے بھی پیش کیا ہو، اُردو ادب اور تنقید میں سلیم احمد نے اس کا انطباق بڑی ذہانت سے کیا ہے۔ اُردو میں اس تصور کو قبولِ عام عطا کرنے میں سلیم احمد کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔

سلیم احمد کا "پورا آدمی" دراصل جسم اور روح کی اور ذہن اور دل کی مکمل ہم آہنگی کا نام ہے۔ وہ بار بار اوپر کا دھڑ اور نیچے کا دھڑ کہتے ہیں تو اُن کی مراد ذہنی اور روحانی کیفیات اور جنسی وجسمانی ضروریات ہوتی ہیں۔ یہ سب چیزیں مکمل اور پورے آدمی کی تشکیل کے لئے ضروری ہیں۔

سلیم احمد کے کچھ ہمعصر ناقدین مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے بھی پورے آدمی کا تصور اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے لیکن سلیم احمد کے بعد۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے مادری پدری اُصول کہا ہے جبکہ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے اس تصور کو زمینی آسمانی رشتوں کی اصطلاحات میں پیش کیا ہے۔ سلیم احمد نے اپنے تصور کو زیادہ واضح، جاندار اور جارحانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

شمیم احمد کہتے ہیں "مجھے بے حد شک ہے کہ سلیم احمد کا پورا آدمی وہی ہے جو غدر سے پہلے تھا اور اب ہمیں میراجی کی مسخ شدہ شکل میں اپنی طرف بلا رہا ہے۔ "۳۲

اپنے مضمون میں یوں تو اُن سب نظم گو شعراء کی خبر لی گئی ہے جو اُن کے خیال میں ادھورے ہیں لیکن اختر شیرانی پر عتاب قدرے زیادہ ہے۔ اُن کی سلماؤں ریحاناؤں پر خصوصی "نوازش" سے کام لیا گیا ہے۔ نہ صرف "پیغمبر رومان" کو بلکہ اُس کی ہمعصر ساری نسل کو بانجھ قرار دے دیا گیا ہے۔

انتظار حسین نے بھی "نئی نظم اور پورا آدمی" کو پڑھنے کے بعد اسی قسم کا تبصرہ کیا اور ہفت روزہ "نصرت" کے ادبی کالم نگار "فکری" نے بھی۔ انتظار حسین لکھتے ہیں۔ "سلیم احمد نے راشد اور میراجی والی نئی نسل کے حوالے سے لندھور بن سعدان کی داستان لکھ ڈالی ہے۔۔۔۔ یارو یہ ہمیں کس گنہ کی سزا مل رہی ہے۔ "۳۳

سلیم احمد نے حد سے بڑھی ہوئی رومانیت کا تجزیہ کیا، اچھا کیا۔ انہوں نے کسری آدمی کی جو شکلیں ہمیں دکھائی ہیں وہ بھی خاصے کی چیز ہیں لیکن اس معاملے میں اُن کا حد سے بڑھ جانا مستحسن نہیں سمجھا گیا۔ وہ جب پورے آدمی کے تصور کو اُردو شاعری بالخصوص نئی نظم کی سطح سے اُوپر اُٹھا کر عالمی اور آفاقی سطح تک لے جاتے ہیں تو بات دل کو لگتی ہے۔

ایک بار اُن سے ایک انٹرویو میں پوچھا گیا کہ کیا آپ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں اپنے نظریات (شاعری کی تنقید) سے اب تائب ہو چکے ہیں یا نہیں؟ تو سلیم احمد نے نہایت جراءت سے کہا۔ "پہلی غلطی یہ کہ آپ نے یہ کہا کہ مجھے تائب ہونا پڑا۔ لیکن الحمدللہ مجھے کبھی تائب نہیں ہونا پڑا۔ یہ چیزیں اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہیں تو میں اس بات کو بالکل درست نہیں سمجھتا۔ "۳۴

سلیم احمد نے مزید کہا کہ مولانا سعدیؔ، مولانا رومیؔ اور حکیم مومن خان مومنؔ کے ہاں جنسی کا بے تکلفانہ اظہار پایا جاتا ہے۔ ہمارے یہ اکابرین جنسی کے معاملے میں کسی کمپلیکس کا شکار نہیں تھے۔ اسی تکمیل کی تلاش مولانا روم کو تھی اور اسی تکمیل کی خواہش سلیم احمد کرتے ہیں۔

"نیا عہد نامہ۔ بابِ پیدائش" نامی مضمون بھی گزشتہ سے پیوستہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ مضمون دراصل سلیم احمد کی طرف سے "جواب آں غزل" ہے اُن ناقدین کے لئے جن کا اعتراض یہ ہے کہ "پورے آدمی" کے تصور کو سلیم احمد نے رومانوی تحریک اور ترقی پسند تحریک پر منطبق کر کے اس کی معنویت کو محدود کر دیا ہے۔ بقول سلیم احمد "آدمی کی پیدائش کا صحیح، فطری طریقہ یہ ہے کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہو لیکن نیا آدمی (کسری آدمی) مغرب کے دماغ سے پیدا ہوا ہے۔"

پُورے آدمی اور نئے آدمی کی یہ بحث ہمیں سلیم احمد کے مضمون "غالب اور نیا آدمی" میں بھی ملتی ہے۔ "حالی سے لا مساوی انسان تک" سلیم احمد کا ایک اور طویل مضمون ہے جو اُردو نظم کے حوالے سے حالی سے راشد تک کسری آدمی کے سفر کی داستان بیان کرتا ہے۔

سلیم احمد کہتے ہیں بین الاقوامی منظر نامے کی پر چھائیاں برِ عظیم میں اُردو شعراء پر بھی پڑتی رہتی ہیں۔ عالمی سطح پر صورت حال یہ ہے۔

نطشے نے کہا "خدا مر گیا ہے۔ "لارنس نے کہا "انسانی تعلقات کا ادب مر گیا ہے۔"

مالرو کہتا ہے۔ "انسان مر گیا ہے۔" اُردو ادب کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے سلیم احمد کہتے ہیں۔ "کوئی وقت جاتا ہے کہ جب نظم باقی رہے گی نہ غزل۔ ایک اطلاع یہ ہے کہ راشد صاحب "لا مساوی انسان" میں انسان کی کسی تعریف کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں لیکن ان کی واپسی تک میں اپنے مفلر والے حالی کو اس کی بصیرت کی داد تو دے ہی دوں جس نے نئی شاعری کی داغ بیل ڈالنے کے باوجود دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا تھا۔ "شاعری نئی ہو یا پُرانی چلتی نظر نہیں آتی ہے۔"

"عشق اور قحطِ دمشق" میں سلیم احمد نے دو انسانی جبلتوں بھوک اور جنس کے تقابلی موازنے کے بعد عشق کے جذبہ صادق اور بالآخر پورے وجود کے ساتھ عشق کرنے کی اہمیّت کو بیان کیا ہے۔

"نئی شاعری نا مقبول شاعری" حلقہ ارباب ذوق (کراچی) میں پڑھے گئے مضامین کا ایک مربوط سلسلہ ہے۔ ان مضامین میں سلیم احمد نے سوال در سوال، ایک اہم ادبی مسئلے کی مختلف پرتوں کو کھولا ہے۔ پہلے مضمون میں "نئی شاعری" کی حدود متعین کی ہیں تاکہ آگے چل کر بحث

میں ابہام پیدا نہ ہو۔

"نامقبول شاعری" کی اصطلاح کے بارے میں سلیم احمد کی وضاحت یہ ہے کہ غالب اپنے زمانے میں نامقبول یا نسبتاً کم مقبول شاعر تھا مگر اب وہ مقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑ چکا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نامقبولیت کا گراف وقت، ماحول اور ذوق کے تقاضوں کے مطابق گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ کسی بھی شاعر کو مستقل طور پر نامقبول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مضمون میں سلیم احمد نے ایذرا پاؤنڈ کے حوالے سے لکھا ہے کہ نقاد کو کبھی کبھی ایسے سوال بھی اٹھانے چاہئیں جن کا جواب خود اسے بھی معلوم نہ ہو۔ سلیم احمد نے سجاد میرؔ اور ضیا جالندھری کے علاوہ فاطمہ حسن، عزیز ہاشمی، احمد ہمیش، ساقی فاروقی اور عبید اللہ علیم کے ردِ عمل سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔ مذکورہ ردِ عمل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سلیم احمد نے ہلکی پھلکی کمنٹری بھی کی ہے جو قاری کو اگلا مضمون پڑھنے کے لئے تیار کر دیتی ہے۔ سلیم احمد کا اصرار ہے کہ نئی شاعری میں کوئی ایسی گڑبڑ ضرور ہے کہ معاشرہ اسے قبول نہیں کر پا رہا یا پھر معاشرہ ہی میں کوئی ایسی وجہ ہے۔

ان تمام نکات میں ضیاء جالندھری کی باتیں زیادہ قابلِ غور تھیں۔ اُنہوں نے کہا کہ تقسیم ہند سے قبل جب یہ شاعری شروع ہوئی تو ملک بھر میں ایک دھوم مچ گئی تھی لیکن تقسیمِ ہند کے بعد صورت حال بدل گئی۔ انہوں نے کہا کہ شاعری کی مقبولیت میں سیاست اور مذہب نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے جبکہ نئی شاعری، خالص شاعری ہے۔ سلیم احمد کے دلائل و براہین کے مطابق نئی شاعری اپنی فطرت اور ماہیت، مواد، ہیت اور طریقہ کار کی وجہ سے نامقبول ہے۔ یہ نامقبولیت اس کی دائمی اور جوہری صفت ہے۔

سلیم احمد بڑے تیقن سے کہتے ہیں کہ نئی شاعری کے بارے میں اُن کا رویہ "ٹریولرز گائیڈ بک" کی روشنی میں کسی ملک کی سیاحت کرنے والے سیاح کا نہیں ہے بلکہ یہاں تو عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں، والا معاملہ ہے۔

نظریاتی تنقید کے ساتھ ساتھ سلیم احمد نے عملی تنقید کو بھی چھوا ہے۔ انہوں نے ضیاء جالندھری

کی نظم "بشارت" کا نہایت عمدگی سے فنی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ابلاغ عدم ابلاغ کیسے ہوتا ہے۔ لُبّ لباب یہ ہے کہ نئی شاعری نئی اور نامانوس ہیتوں کے استعمال سے خود ہی اپنے آپ کو معاشرے سے منقطع کر رہی ہے۔ اب اس میں جمالیات اظہار کے تسلسل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آخر میں سلیم اتنی رعایت دیتے ہیں کہ اگر نئی شاعری اپنے آپ کو قائم رکھنا چاہتی ہے تو لازمی طور پر اپنی فنی حیثیت اور جانے پہچانے انسانی عناصر کو سمو کر ہی کر سکتی ہے۔

"روایت اور الہام" بھی ادبی حلقوں میں بہت دیر تک موضوع بحث بنا رہا۔ اس مضمون میں انہوں نے "طرح" پر غزل کہنے کی بات کی ہے۔ طرح پر غزل کہنے کا تصور پوری طرح تہذیب سے وابستہ ہے۔ اس میں تخلیق، تخلیقی عمل اور تخلیقی طریقہ کار کے تصورات تو شامل ہیں یہی ان سے بھی آگے جا کر اس کے ڈانڈے عبادات، روحانی ریاضت اور اخلاقیات سے بھی مل جاتے ہیں۔ سلیم احمد کہتے ہیں۔ "۔۔۔۔۔ تو طرح پر کہنے کے لئے میں اس طرح بیٹھتا ہوں جس طرح نماز کے لئے نشست کرتا ہوں۔ الہام ہو گیا تو شعر ورنہ مشق کا ثواب تو کہیں گیا نہیں۔"

اسی قسم کے خیالات کا اظہار "ارادہ اور شاعری" اور "طرحی مشاعرے کی بات" میں بھی کیا گیا ہے۔ سلیم احمد کہتے ہیں شاعر کو بھی چاہیے کہ عمل اور افادی دنیا سے کنارہ کشی کی کوشش کرے اور تخلیق کی پُر اسرار وادی میں داخل ہو۔ شعر بالقصد کے لئے بیٹھنا نماز کی نیت کی طرح ہے۔ نیت کیا ہے ایک "دنیا سے دوسری دنیا میں داخلہ کا اسم اعظم ہے۔ یہ اپنی انا کے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے خدائے لامحدود کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر آمادہ کرنا ہے شعر بالقصد بھی شاعری کو اسی طرح اپنی طرف بلاتا ہے۔ ان مضامین میں بحث تو وہی حالی کی آمد اور آورد والی ہے لیکن سلیم احمد کی ٹریٹمنٹ نے انہیں نہایت دلچسپ اور زیادہ مؤثر بنا دیا ہے۔

سلیم احمد کا خیال ہے کہ جذباتی انداز کی شاعری کے لئے ۱۸ سے ۲۵ سال کی عمر "موزوں" ہے۔ اس کے بعد اکثر شعرا یا تو اپنے آپ کو دہرانے لگتے ہیں یا چُپ چاپ اُستاد بن جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا عمر شاعرانہ شخصیت، تنظیم، عمل، کوشش اور پابندی اور ہر اس چیز کی نفی کرتی ہے جس کو

کلاسیکی تہذیب ضروری خیال کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سلیم احمد کے بقول۔ "میٹھے برس کے ساتھ شاعری شروع ہوتی ہے اور چار چھ سال میں ٹھکانے لگ جاتی ہے۔"

"چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے" میں سلیم احمد نے میر انیسؔ کی شاعرانہ تفہیم کے لئے ایک نیا زاویہ تلاش کیا ہے۔ انہوں نے اُردو شاعری میں انسان کی مختلف شکلیں گنوائی ہیں مثلاً انسان بطور عاشق (جس کی جگہ کاوی میرؔ کے ہاں قشقہ بن گئی ہے)، انسان بطور فرد (غالبؔ)، انسان بطور تماشائی (نظیر اکبرآبادی) اور انسان بطور ایک تخلیقی وجود (اقبال)۔ میر انیسؔ کے ہاں انسان بطور خاندانی رشتوں کے پایا جاتا ہے۔

سلیم احمد کے آخری تنقیدی مجموعہ میں دو مضامین ایسے بھی ہیں جن میں سلیم احمد کا ایک نیا اسلوب جھلکتا ہے۔ "الف۔ میں اور شام کا وعدہ" اور "حکایت یوسف اور ہم" ہماری ذہنی تصویر ہماری ذات کے بارے میں ہمارا ایک دلکش خیال ہوتا ہے ہم اس کی آرائش و زیبائش کرتے رہتے ہیں یہ خوابیدگی اتنی گہری ہوتی ہے کہ ہم ایک جھوٹا شخص اوڑھ لیتے ہیں۔ لارنس نے اپنے مضمون "کپتان کا گڈا" میں اسی عمل کو دکھایا ہے۔ ہم سب اپنی محبتوں اور نفرتوں میں حقیقی انسانوں کے گڈے بنا لیتے ہیں۔ ان گڈوں کو قید کر لیتے ہیں یا ان سے کھیلتے رہتے ہیں۔ یہاں سلیم احمد نے اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے کہ حضرت انبیاء کے خواب کا معاملہ عام انسانوں سے مختلف ہوتا ہے اور حضرت یوسفؑ نے اپنا کوئی بُت نہیں بنایا تھا۔

۸۔ تہذیبی مسائل

سلیم احمد کے تنقیدی موضوعات کا ایک اہم دائرہ تہذیبی مسائل سے متعلق بھی ہے۔ وہ ایک زندہ اور بیدار لکھنے والے کی حیثیت سے اپنی شاندار تہذیب اور اس کی اعلیٰ اقدار سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ اعلیٰ تہذیب کب اور کیسے زوال آشنا ہوئی۔ اس سلسلے میں اُن کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز مضمون "تہذیب کا جن" ہے۔ "اقبال اور ہند اسلامی تہذیب" میں سلیم احمد نے افکارِ اقبال کی روشنی میں ہند اسلامی تہذیب کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے اس

مضمون میں تہذیب جدید کی درجہ بدرجہ جارحیت اور نفوذ کے نمونے پیش کیے ہیں۔

سلیم احمد عمر بھر "تہذیب" کے اہم سوال سے لڑتے رہے۔ اس سلسلے میں اُن کا ایک اور مضمون بھی نہایت اہم ہے "اسلامی زندگی مع چھ رنگین ناچوں کے" اس میں انہوں نے تہذیبِ جدید کے زیرِ اثر ہمارے فن یا آرٹ کی ممکنہ صورت پر روشنی ڈالی ہے۔

پیوندکاریاں واقعی اسلامی زندگی کی سچی تصویر پیش نہیں کرتیں لیکن جہاں تک اسلامی آرٹ کا تعلق ہے تو اقبال نے مرّقع چغتائی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اسلامی آرٹ کا ظہور ابھی باقی ہے تاہم مستقبل میں اسلامی آرٹ کی صورت گری کے حوالے سے سلیم احمد کا یہ ایک فکر انگیز مضمون ہے۔

"ادھوری جدیدیت" اِس تہذیبی موضوع کے حوالے سے سلیم احمد کا پہلا مضمون ہے جس میں اُن کی فکر کا ایک نیا رُخ متعیّن ہوا ہے۔ سلیم احمد کہتے ہیں کہ جدیدیت کا مطلب اثبات کے دروانے بند کر لینے کا نہیں بلکہ جھگڑا تو ادھوری جدیدیت اور پوری جدیدیت میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بد قسمتی سے مغرب میں اور اُس کے زیرِ اثر مشرق میں جو جدیدیت رائج ہے وہ ادھوری جدیدیت ہے۔

۹۔متفرقات

گزشتہ صفحات میں سلیم احمد کی تنقیدات کے خصوصی موضوعات کا جائزہ لیا گیا۔ کچھ ایسے موضوعات بھی ہیں جو متفرقات کی ذیل میں آتے ہیں۔ اِن میں سے نسبتاً اہم تر موضوع نظریہء پاکستان، پاکستان اور ثقافت پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِن موضوعات پر زیادہ تر تو انہوں نے اپنے اخباری کالموں میں اظہارِ خیال کیا ہے تاہم یہ کالم بعض اوقات مستقل مضمون کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ایسے کالم نما مضامین میں درج ذیل اہم ہیں۔

۱۔اسلامی ادب کا مسئلہ، ۲۔ پاکستانی ادب کا مسئلہ، ۳۔ قومی تشخص کا مسئلہ، ۴۔ ادب اور ثقافت، ۵۔ نظریاتی مملکت میں ادیب کا کردار، ۶۔ ادب اور قومی شعور، ۷۔ کچھ نظام تعلیم کے بارے میں۔

سلیم احمد کا اسلوبِ تنقید

سلیم احمد کے اسلوبِ تنقید کے سلسلے میں اُنہی کا ایک اقتباس دیکھئے۔ "اسلوب شخصیت کا عطر ہے، جوہر ہے۔ یہ بجلی کی وہ رو ہے جو شخصیت سے پھوٹ رہی ہے۔۔۔ یہ ہماری سوانح عمری ہوتا ہے۔۔۔ ہم خود کو کتنا ہی چھپائیں مگر اسلوب ہمیں ظاہر کر دیتا ہے۔ یہ ہمارا ایسا پردہ در ہے کہ در انداز دشمن اور راز دار دوست بھی نہ ہوگا۔ اسلوب ہمیں بتاتا ہے کہ ہم کیا ہیں؟ خود کو کیا سمجھتے ہیں۔ اوروں کی طرف ہمارا روّیہ کیا ہے؟ ہم دنیا سے کیا تعلق رکھتے ہیں۔ دراصل اسلوب ہی ہماری شخصیّت ہے۔"[۳۵]

سلیم احمد کے تنقیدی اسلوب میں اہم ترین خوبی "دلچسپی" ہے۔ یہ سدا بہار رنگ اُن کے اوّلین تنقیدی مجموعہ سے آخری تنقیدی کتاب تک، ہر جگہ اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ یہ دلچسپی قاری اور مصنف کے رشتے کو مستحکم کرتی ہے۔ سلیم احمد کو مفرور قاری کی گمشدگی کا گلہ کبھی نہیں رہا۔ اُن کی تنقیدی تحریریں ہمیشہ ذوق وشوق سے پڑھی گئیں ان تحریروں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے قابلِ مطالعہ اور دلچسپ ہونے میں دو آراء نہیں ہیں۔

اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے لئے اگر نطشے کے رزتشت کے "نٹ" کا روپ بھی بھرنا پڑا تو انہوں نے دریغ نہ کیا۔ اس سے بعضے نازک مزاج لوگوں کو یہ شکایت بھی پیدا ہوئی کہ سلیم احمد کا طرزِ تحریر علمی نہیں ہے۔ سلیم احمد نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "میں ایسے "علم" کا مدّعی بھی نہیں ہوں جو پڑھنے والے کے ذہن میں کوئی اضطراب پیدا نہ کرے۔ میں نے خود بھی یہ مضامین بہت اضطراب کی حالت میں لکھے ہیں۔"[۳۶]

سلیم احمد کہتے ہیں کہ اگر میں گفتگو کر رہا ہوں اور لوگ سو رہے ہیں تو مجھے ایسے قارئین یا سامعین کی ضرورت نہیں۔ پہلا فقرہ اور پہلا پیراگراف ہی اس قدر مؤثر اور دلچسپ ہوتا ہے کہ پڑھنے سننے والا فوراً چونک اُٹھتا ہے اور یہ "چونکانا" ہی ان کے اسلوب کی ایک خاص پہچان ہے۔ ابن صفی نے ایک بار کہا تھا۔ "سلیم احمد اپنے مضمون کا پہلا فقرہ اس طرح لکھتا ہے۔ جسے ڈگڈگی بجا

رہا ہو۔۔۔۔"

چند تمہیدی فقرے ملاحظہ فرمایئے جو مؤثر بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ یہ فقرے مختلف مضامین کا سرِ آغاز ہیں۔ "عورت کی طرح شاعری بھی پورا آدمی مانگتی ہے۔ آپ عورت کو خوبصورت الفاظ سے خوش نہیں کر سکتے۔۔۔۔" (نئی نظم اور پورا آدمی)

" کہتے ہیں نزلہ عضوِ ضعیف پر گرتا ہے لیکن اُردو شاعری کی پچھلی سو سالہ تاریخ میں عضوِ رئیس پر گرا ہے۔" (غزل مقلر اور ہندوستان)

"جس طرح پُرانے زمانے کے لوگوں پر جن آتے تھے اسی طرح ہمارے زمانے کے اکثر لوگوں پر لفظ آتے ہیں۔" (تہذیب کا جن)

تمہیدی جملوں کے علاوہ دوران مضمون میں بھی گاہے گاہے ایسے فقرے آتے رہتے ہیں جو پڑھنے والے کی توجہ نفسِ مضمون کی طرف مبذول رکھتے ہیں۔ اس سے تحریر میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ یہ فقرے اس روانی سے کہے جاتے ہیں کہ قاری کو چونکانے کے ساتھ ساتھ اسے سوچنے اور ردِ عمل ظاہر کرنے پر بھی اُکساتے ہیں۔ جوشؔ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"غالبؔ نے کہا تھا" ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال" (مگر) یہ انسان "محشرِ جذبات" ہے۔" (جوشؔ اور آدمی)

"لیکن جلد ہی جوشؔ کے دماغ کی "خطرناک کمانیاں" کھُلنے لگتی ہیں اور عشق کی جگہ عیاشی لے لیتی ہے۔" (جوشؔ اور عشق)

حسن عسکری اور انتظار حسین کے ساتھ ساتھ سلیم احمد بھی "فقرہ بازی" کے لئے بہت مشہور ہوئے کچھ لوگ اس فقرہ بازی کو سلیم احمد کے اسلوب کی جان کہتے ہیں اور کچھ اسے تحریر کا عیب گردانتے ہیں۔ فقرے، چھیڑ خوباں سے چلی جائے، کی مثال بھی ہوتے ہیں، نفس مضمون کو چمکانے کے لئے، کسی گہرے اسرار کی عکاسی بھی کرتے ہیں اور عمومی صورت حال کو بھی پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے۔"فقرہ بازی اسلوب میں LIBERTY لینے کے مترادف ہے

۔تنقید کا فریضہ علمی ہے۔ یعنی سنجیدگی ہو، متانت ہو، شائستگی ہو، یہ سب درست ہے اور اکثریت اسی طرح لکھتی ہے لیکن اگر معاملہ عسکری یا سلیم احمد جیسے انفرادیت پسند کا ہو تو انہیں مروّجہ اسلوب کے سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔۔۔۔ جس طرح تندیِ صہبا سے آبگینہ پگھل جاتا ہے اسی طرح جودتِ طبع مروّجہ اسلوبی سانچے توڑنے کی کوشش کرتی ہے۔"۳۷

چند چونکا دینے والے فقرے دیکھئے۔ "ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں، جس کا ہاتھی اُس کا ناؤں اور اس سے کون انکار کرے گا کہ نظم جدید کا ہاتھی سب سے پہلے میرا جی اور راشد نے نکالا۔" (نئی نظم اور پورا آدمی)۔

"آخری خبر مجموعہ کی بجائے اخباروں میں چھپی۔ مجاز ایک شراب خانہ کی چھت پر سردی سے سکڑ کر مر گئے۔" (نئی نظم اور پورا آدمی)

تنقید، کہانی تو ہوتی نہیں کہ لوگ متوجہ رہیں۔ ایک خشک تحریر کو پڑھ کر قاری جہاں نقاد سے بدظن ہو جاتا ہے وہاں وہ تنقید کے بارے میں بھی ایک "بے رنگ، بے بو، بے ذائقہ" قسم کا تاثر قائم کر لیتا ہے۔ چنانچہ سلیم احمد جہاں قاری کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اور تحریر کی بے رنگی کو ختم کر کے دلچسپی کے مختلف عناصر استعمال کرتے ہیں، وہاں وہ علمی سنجیدگی کا بھی پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ نتیجۃً اُن کے ہاں ایک "سنجیدہ شگفتگی" کا سا احساس ہوتا ہے۔ "سنجیدہ شگفتگی" جس قدر کہنا آسان ہے، اسی قدر اس کا برتنا مشکل ہے۔ اس کٹھن کام میں تو "بڑے بڑے چیں بول جاتے ہیں۔"

سلیم احمد جہاں ایک بڑے نقاد تھے وہیں ایک تجربہ کار ڈراما نویس بھی تھے چنانچہ ان کے تنقیدی اسلوب میں کہیں کہیں حسبِ ضرورت یہ ڈرامائی رنگ ملتا ہے۔ مثلاً "اِقبال۔ ایک شاعر" کے اختتامیہ میں وہ لکھتے ہیں۔ "میں کتاب کے شروع میں حاضر ہونے کی بجائے کتاب کے آخر میں حاضر ہوا ہوں۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ آپ کے کتاب پڑھنے سے پہلے آپ کی رائے کو متاثر کروں۔ " دوسری بہت سی باتوں کی طرح سلیم احمد نے یہ اسلوب بھی عسکری ہی سے سیکھا ہے۔

سلیم احمد کی خوبصورت منظر نگاری ہی نے اُن کی تحریروں میں ایک عجیب قوس وقزح اُتار دی

ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، اُس کا اثر کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ مثلاً اپنے ایک مضمون میں وہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ انہیں سرسیّد اور حالی کا مخالف سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ ان دونوں بزرگوں سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں رکھتے بلکہ اُن کا اختلاف اُصولی اور نظری ہے۔ سلیم احمد جس روش پر گامزن ہونا چاہتے ہیں، اُس کی منظر نگاری نہایت اثر آفریں کی ہے۔

"۔۔۔۔۔ مجھے اس راستے کی عظمت کا احساس تھا کہ اب یہ دیہاتیوں کی پگڈنڈی ہے۔ شہر کا راستہ اور ہو گیا ہے۔ میں تماشا بننے سے ڈرا، ورنہ سرسیّد کے حوض کے مقابل میٹھے پانی کا چشمہ بھی موجود تھا۔ اس کا پانی گدلا، ریت ملا اور تہہ نشین ہو گیا تھا مگر تھا آبِ حیات، یہ دیوبند کا چشمہ تھا، میں علی گڑھ نہیں گیا، نہ دیوبند، بس میرٹھ میں بیٹھا رہا۔" ۳۸

سلیم احمد کو الفاظ کے استعمال پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ وہ موضوع کی مناسبت سے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ کہیں کومل، کہیں بھاری اور کہیں متوازن الفاظ لاتے ہیں۔ یہ مقام انہیں اک عمر کے ریاض کے بعد ملا۔ عمر کے ابتدائی حصّے میں انہوں نے مختلف نامورانِ ادب کے اسالیب نظم و نثر کو اپنانے کی مشق کی تھی۔ چنانچہ اُن کا قلم خود بخود لفظوں کے گُل بوٹے بناتا چلا جاتا ہے۔ یہ الفاظ عربی، فارسی، ہندی، انگریزی اور دیگر کئی زبانوں سے آتے ہیں اور اُردو کے دامن کو کشادگی بخشتے ہیں۔

سلیم احمد کوئی بات بغیر دلیل یا بنیاد کے نہیں کہتے تھے لیکن یہ بات ہے کہ تحقیقی حوالے دیتے ہوئے انہیں خاصی کوفت ہوئی تھی۔ وہ حوالوں سے اپنی عبارت کو بوجھل بنانا پسند نہیں کرتے تھے۔ "اقبال۔ ایک شاعر" کے پہلے ایڈیشن پر جب اعتراضات وارد کیے گئے تو انہوں نے مجبوراً دوسرے ایڈیشن میں وہ حوالے دیئے جن سے اُن کے مؤقف کو تقویت ملی۔

سلیم احمد دراصل تحقیقی نقاد کی بجائے ایک تخلیقی نقاد تھے۔ اُن کے اسلوبِ تنقید میں بھی اُن کا یہی انگ اور رنگ نمایاں ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے یا بولتے، وہ برسوں کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کا نچوڑ تھا۔ وہ مطالعہ جو اُن کے خون کی گردش اور دل و دماغ کا حصّہ تھا۔ نہ صرف مطالعہ یا مشاہدہ بلکہ اس کے نتائج بھی اخذ کر چکے تھے جو اُن کے لفظ لفظ اور سطر سطر سے ٹپکتے تھے۔

سلیم احمد کا حافظہ بہت تیز تھا۔ برسوں پہلے پڑھی ہوئی تحریر یا لکھی ہوئی شے بھی اُن کے حافظے میں محفوظ رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی کئی کتابیں ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ میں مکمل کیں لیکن جہاں موقع آیا انہوں نے حوالہ نہیں دیا، یا اگر دیا بھی تو نامکمل۔ اس سلسلے میں سلیم احمد کا مؤقف یہ تھا۔ "حوالے نہیں دوں گا تاکہ آپ یا تو بات پر اعتبار کرنا سیکھیں یا خود مضمون پڑھنا۔ اِن دونوں باتوں کے بغیر صرف مُرغ بازی سے مزہ لینے کی کوشش نہ کریں۔"

یہاں "مُرغ بازی" کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اسی طرح اُن کی معروف لفظیات میں سے بقراطیت ،سفاک، ناچتا ہوا شعلہ، گُونج، سچائی وغیرہ بھی بار بار آتے ہیں اور خاص معنی ادا کرتے ہیں۔

سلیم احمد کی تحقیقی کاوش لفظوں، حوالوں یا ضمنی باتوں کے لئے نہیں ہوتی بلکہ اُن کی اصل توجہ موضوع زیرِ بحث کی گہرائی اور وسعت و اہمیت پر مرکوز ہوتی ہے۔ مثلاً شخصیات پر لکھتے ہوئے یا مختلف ادوار پر تنقید کرتے ہوئے وہ مرکزی مسئلہ تلاش کرتے ہیں اور پھر اس کے اردگرد دلائل و براہین کا تانا بانا بُنتے ہیں۔ حسن عسکری کا اسلوبِ تنقید بھی یہی تھا۔ جسے سلیم احمد نے بھی اپنایا۔ یوں بھی تنقید ہو یا شاعری، سلیم احمد نے عسکری ہی سے فیض پایا ہے اور اس فیض یابی کا برملا اعتراف بھی کیا ہے۔

اُردو تنقید میں سلیم احمد کا مقام

سلیم احمد کے تنقیدی موضوعات اور اُن کے اسالیبِ بیان اپنی جگہ۔۔۔۔لیکن اصل سوال یہ ہے کہ وہ تنقید لکھتے کیوں تھے؟

سلیم احمد کے لئے تنقید کوئی بازیچہء اطفال نہ تھی۔ یہ اُن کے لئے دل لگی کا سامان اور وقت گزاری کا بہانہ نہ تھی بلکہ تنقید تو اُن کے لئے زندگی، سچائی، حُسن اور خیر کی تلاش کا نام تھی۔ وہ لفظ نہیں لکھتے تھے بلکہ لفظ خود انہیں لکھواتے تھے، تنقید اُن کے لئے روز وشب کی تسبیح اور وظیفہء حیات تھی۔ لکھنا اُن کے لئے عبادت تھا۔ وہ جب نہیں لکھتے تو بولائے پھرتے تھے۔

اُن کے لئے غم روزگار ایک ثانوی چیز تھی۔ اصل غم زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کی تخلیق

تھا۔ اُن کے پہلے ہی تنقیدی مضمون کا عنوان (زندگی ادب میں) اُن کی آنے والی زندگی کے اسلوب اور ترجیحات کو متعین کرتا ہے۔ انہیں اپنی ادبی زندگی کا کس قدر احساس تھا؟ یہ اُن کے پہلے تنقیدی مجموعہ (ادبی اقدار) کے دیباچہ بعنوان "ادبی موت" سے ظاہر ہے۔ "اس طرح اس مختصر سے مجموعہ سے آپ میری ذہنی ترقی یا انحطاط کا حال آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ اگر ترقی نظر آئے تو یقین کر لیجئے کہ ریڈیو پاکستان کی ملازمت ذہنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتی ہے اور انحطاط نظر آئے تو مجھے کوسیئے کہ میں نے روٹی کے معاوضہ پر اپنی روح بیچ دی۔"

سلیم احمد روحِ ادب تھے۔ وہ عمر بھر یہ روح اپنے ماحول اور جسدِ حیات میں پھونکنے کے لئے کوشاں رہے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے اس حقیقی اور سچی روح کو پہچانتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک کسی معاشرے میں یہ روحِ ادب اور تنقیدی بصیرت پیدا نہیں ہوتی، وہ معاشرہ ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ ادب و فن سے بے بہرہ معاشرے کو وہ انتشار کی خبر دیتے ہیں۔ وہ اپنے قلب و نظر کے سارے اضطراب کو اپنی تحریروں میں سمو کر اپنے ماحول کو آنے والے انتشار سے بچا لینا چاہتے ہیں۔ انگریزی محاورے کے مطابق "سلیم احمد چشمِ طوفاں میں پائے جاتے ہیں۔"

بعض لوگوں نے سلیم احمد کی مضطربانہ تحریروں کو بنیاد بنا کر اُنہیں مصلح، سر سیّد ثانی یا چھوٹا حکیم الامت کہنا بھی شروع کر دیا تھا جبکہ سلیم احمد نے معرکۂ حیات میں جو کچھ بھی دادِ شجاعت دی وہ علمی، ادبی اور فنی ہتھیاروں ہی سے لڑ کر دی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا۔ "واعظ تو میرے اندر نہیں تھا لیکن ایک ایسا آدمی ضرور تھا جو انسانوں کی اور قوموں کی تقدیر سے اور ان کے بننے بگڑنے سے بہت دلچسپی رکھتا تھا۔"

سلیم احمد جب تک لکھتے رہے، پورے احساسِ فرض اور اخلاصِ نیّت کے ساتھ لکھتے رہے۔ یُوں لکھنے کو انہوں نے ہزاروں صفحات لکھ ڈالے لیکن وہ صرف اپنی ادبی تحریروں کو OWN کرتے تھے۔ باقی سب تحریریں اُن کے نزدیک "سیٹھ کا مال" یا کمرشل تحریریں تھیں۔ اُن کی تحریروں میں تنقیدی مضامین سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ سلیم احمد کا ایک شعر ہے۔

میری زبانِ آتشیں لو تھی مرے چراغ کی　　　میرا چراغ چُپ نہ تھا تیز ہوا کے شور میں

یہ شعراُن کے تنقیدی روّیے کا بھی غماز ہے۔زبانِ آتشیں ہو یا تحریرِ آتشیں، سلیم احمد کی نمایاں پہچان ہے۔ادب اور تنقید میں وہ کسی سمجھوتے کے قائل نہ تھے۔اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے برملا کہا۔

"ادیب اور مملکت کی جنگ میں میں ادیب کی حمایت کروں گا اس لئے کہ مملکت اگر معاشرے کے ظاہری وجود کی حفاظت کرتی ہے تو ادیب اس کے داخلی حسن وصداقت کا محافظ ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ سلیم احمد ایک جنگجو قسم کے نقاد ہیں۔ وہ کبھی معاشرے سے لڑتے ہیں اور کبھی مملکت سے، کبھی مشرق ومغرب کو برسرِ پیکار دیکھتے ہیں تو کبھی غالب اور اقبال کے حوالے سے تیغ وسناں سنبھالے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ نجانے کس کس سے لڑتے رہے حالانکہ اصل لڑائی تو اُن کی اپنے آپ سے تھی۔ "۔۔۔۔۔۔کیا میں نقاد کہلانا چاہتا ہوں؟ لعنت ہو مجھ پر۔ میں تو صرف اپنے وجود کا حال لکھنا چاہتا ہوں چاہے وہ تنقید ہو یا شعر ہو یا ڈراما ہو یا کچھ ہو اور بس۔۔۔۔۔"

بعض لوگوں نے اپنی سہولت کے لئے زندگی اور ادب وفن کے مختلف خانے بنا رکھے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر شخصیت کو کسی نہ کسی خانے میں قید کردیں یا اُس پر اپنی پسند کا کوئی لیبل لگادیں حالانکہ کوئی بھی شخصیت سدا ایک ہی رنگ میں ظاہر نہیں ہوتی۔آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال ہی نہیں محشرِ انقلاب بھی ہے۔چنانچہ سلیم احمد کے ضمن میں بھی لوگوں کو یہی مشکل پیش آتی ہے۔اُن کے شخصیت اور تنقیدی نشیب وفراز کو سمجھنے کے لئے ایک دانشور نے "ایٹمی ری ایکٹر" کی تشبیہ تراشی ہے۔سراج منیر کہتے ہیں۔"اصل میں مشکل کام ایٹمی ری ایکٹر بنے رہنا ہے۔تابکار رہنا اور تابکاری پھیلاتے رہنا۔اس میں اتنی حدت پیدا ہوتی ہے کو لوہے کو گیس بنادے لیکن اس کا براہِ راست ظاہر ہونا ممنوع ہے۔"

سلیم احمد لکھتے ہیں" آرٹ کا مقصد تہذیب انسانی کو اسی خطرے سے بچانا ہے۔جب غار کا آدمی مکمل طور پر غالب آنے لگتا ہے تو آرٹ سماجی آدمی کو آگے بڑھانے لگتا ہے اور جب سماجی آدمی کامل طور پر فتح یاب ہونے لگتا ہے تو آرٹ غار کے آدمی کی مدد کو پہنچ جاتا ہے۔"

فراق گورکھپوری نے بھی کہا تھا کہ میری شاعری کا مقصد یہ ہے کہ روحانیت میں تھوڑی سی مادیت پیدا ہو اور مادیت میں تھوڑی سی روحانیت ۔۔۔ یہ دراصل ایک توازن کی کوشش ہے۔ سلیم احمد بھی ادب و فن میں اسی توازن کے لئے کوشاں رہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان کا خیال ہے کہ سلیم احمد "لگاؤ" کی بجائے "لاگ" کے نقاد ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کے نقطہ نظر سے سلیم احمد کا اصل تشخص "اسلام اور پاکستان" کے حوالے سے ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اُن کا تعلق "ملامتیہ فرقہ" سے ہونے کا امکان ظاہر کیا ہے۔

ڈاکٹر خواجہ زکریا کے بقول "پروفیسر نقادوں سے بہتر ہیں اور چونکاتے ہیں" سلیم احمد خود کیا ہیں اُنہی کے ایک شعر کے مطابق اُن کا حال کچھ یُوں ہے۔

قافلے آتے جاتے رہتے ہیں
میں گزرگاہ ہوں خیالوں کی

اچھا خیال جہاں بھی ہو وہ اُس کی تائید کرتے ہیں۔ وہ اچھے اور اچھوتے خیال کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس تلاش کے سفر میں انہوں نے کبھی نفسیاتی فارمولوں سے کام لیا، کبھی تقابلی تنقید کو آزمایا۔ کبھی تجزیاتی اور استخراجی انداز تنقید سے کام لیا۔ سب سے بڑھ کر انہوں نے اپنے استاد عسکری کی پیروی میں تخلیقی تنقید کا مشکل راستہ اختیار کیا۔

اُردو تنقید میں کئی بڑے نام تھے اور ہیں۔ کسی کو ناجائز طور پر گرانا یا چڑھانا مقصود نہیں۔ اگر نظرِ انصاف سے کام لیا جائے تو اپنے سات تنقیدی مجموعوں اور ماضی کے نزاعات کے حوالے ہی سے سہی، سلیم احمد کا نام اُردو تنقید میں تادیر زندہ رہے گا۔

سلیم احمد بحیثیت شاعر

سلیم احمد کو شعروسخن وراثت میں ملا اور مناسب ماحول نے اس ذوق کو نکھار بخشا۔ سلیم احمد کی جس پہلی شعری تخلیق کا سُراغ ملتا ہے وہ ایک مثنوی ہے۔ اُس وقت سلیم احمد کی عمر صرف بارہ برس تھی۔ (۱۹۳۹ء) اور وہ ہنرؔ تخلص کرتے تھے۔

میرٹھ میں پہلے فیض عام انٹر کالج میں اور بعد ازاں میرٹھ کالج میں قابل قدر اساتذہ کی راہنمائی میں سلیم احمد کا ذوقِ شعروادب اور بھی چمکا۔ ان اساتذہ کرام میں رزمیؔ صدیقی سے بہت متاثر تھے۔ رزمیؔ صاحب اقبال شناس تھے۔ اُن کے زیر اثر وہ اقبال کے رنگ میں نظمیں کہنے لگے۔ اُن کے ہمعصر ڈاکٹر جمیل جالبی کا بیان ہے۔ "ایک طالب علم کی حیثیت سے اُن کی چند نظمیں مثلاً "موت" اور "چتا" میرٹھ کے ادبی حلقوں میں بہت مشہور ہوئی تھیں۔" "دائرہ ادبیہ" کے ایک جلسے میں سلیم احمد نے ایک نظم سُنائی جس کا ٹیپ کا مصرع، "انقلاب اے انقلاب، اے انقلاب" تھا۔ یہ نظم اتنی پسند کی گئی تھی کہ ساری محفل مجسم واہ واہ سُبحان اللہ بن کر رہ گئی تھی۔"[۱]

اُسی زمانے کی ایک ایسی غزل بھی ہے جسے سُن کر لوگ حیرت زدہ رہ گئے تھے۔

زمین والوں کی مشکلوں کو سمجھ سکیں گے نہ عرش والے
کہ آسماں سے زمیں کے اوپر نگاہ پڑتی ہے طائرانہ

اس دور میں (۴۲ء تا ۴۷ء) اقبالؔ کے علاوہ جوشؔ ملیح آبادی اور ظفر علی خاں کی پابند اور اختر الایمان اور ن م راشدؔ کی آزاد نظموں کے گہرے اثرات بھی سلیم احمد کی شاعری میں بہ آسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اُنہوں نے قطعات نگاری بھی کی اور اس سلسلے میں اقبالؔ

اور فراق سے اثر پذیر ہوئے۔

وہ جیسے مان و سرور کا پانی لہریں لے
وہ سوئی سوئی سی آنکھوں میں گاہ گاہ چمک

ابتدائی برسوں کی اس "متفرق گوئی" کے بعد سلیم احمد نے اپنے لئے غزل کا میدان منتخب کر لیا۔ "۴۷ء کے بعد نظم نگاری ترک کر دی اور صرف غزل کہنے لگے۔ تقریباً پچیس سال تک غزل کے سوا اور کچھ نہ کہا۔"[۲]

سلیم احمد نے غزل میں باقاعدہ یاس یگانہ چنگیزی کی شاگردی بھی اختیار کی۔ اُن کا بیان ہے۔ "یہ غزل جو یگانہ ہی کے رنگ میں ہے، اصلاح کے لئے یگانہ چنگیزی کو بھیج دی اور کسی سے اصلاح لینے کا اتفاق پیش آیا نہ ضرورت محسوس ہوئی۔ "یگانہ کے رنگ میں کہی ہوئی ایک غزل اس طرح سے ہے۔

کیا جھوٹ کیا سچ اللہ جانے
جتنی زبانیں اتنے افسانے

سلیم احمد نہ صرف فراق کی تنقید سے متاثر تھے بلکہ اُن کی غزل اور اس کی تہہ در تہہ نزاکتوں کا اثر بھی قبول کیا۔ اسی دور میں انہوں نے حسرتؔ موہانی اور حالؔی کے اثرات بھی شعوری طور پر قبول کئے۔

سلیم احمد کا بہت سا ابتدائی کلام ۱۹۶۳ء میں اختلالِ ذہنی کے دوروں میں تلف ہو گیا۔ اُن کی شاعری کو ارتقائی لحاظ سے چار ادوار تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پہلا دور: ۳۹ء سے ۴۵ء تک۔ یہ مشقی دور ہے۔ اس دور میں انہوں نے زیادہ تر نظمیں کہیں۔
۲۔ دوسرا دور: ۴۵ء سے ۷۰ء تک۔ یہ پچیس سالہ دور اُن کی غزل کا دور ہے جس میں انہوں نے مختلف اسالیب غزل کو آزمایا۔ ۳۔ تیسرا دور: ۷۰ء سے تقریباً ۸۰ء تک۔ یہ امتزاجی دور ہے۔ سلیم احمد نے نظمیں بھی کہیں اور غزلیں بھی، قطعات بھی لکھے اور ثلاثی بھی۔ حتیٰ کہ نثریے یا نثری نظموں میں بھی طبع آزمائی کی۔ ۴۔ چوتھا دور: ۸۰ء تا اگست ۸۳ء۔ اس دور میں انہوں نے غزل لکھی اور اس میں اپنی الگ پہچان پیدا کی۔

سلیم احمد نے غزل میں اُردو کے تمام اہم کلاسیکی شعراء کے اسالیب بیان کو آزمایا اور اس میں

قدرت حاصل کی۔ اس شعوری منشور کے ساتھ سلیم احمد فراقؔ گورکھپوری، یگانہ چنگیزی، حسرت موہانی اور مولانا حالیؔ کے علاوہ حیدر علی آتشؔ، مرزا غالب، غلام ہمدانی مصحفیؔ اور مرزا رفیع سوداؔ تک پہنچے۔ عسکری کے فرمان کو مانتے ہوئے انہوں نے لکھنوی شعراء صباؔ، رندؔ، رشکؔ اور انشاؔ کے رنگ میں بھی خصوصی مہارت حاصل کی۔ اپنی اس "اُلٹی زقند" کو سلیم احمد نے یُوں پیش کیا ہے۔

"میں اقبالؔ اور جوشؔ سے شروع ہوا اور آگے سفر کرنے کی بجائے پیچھے ہی پیچھے لوٹتا چلا گیا یہاں تک کہ سوداؔ اور ولیؔ تک جا پہنچا۔" ۳؎

ایک روایت ہے کہ مذکورہ ذیل شعر ہی سلیم احمد کا پہلا شعر ہے۔

محبت ہی بنا دیتی ہے مشتِ خاک کو انساں
قوام آب وگل سے بھی کہیں انسان بنتے ہیں

سلیم احمد کی غزل

سلیم احمد کی شاعری کا دوسرا دور جو کہ مکمل غزل گوئی کا دور ہے، مزید دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ کلاسیکی شعراء کے رنگ میں ہے جبکہ دوسرا حصّہ اینٹی غزل یا باغیانہ غزل پر مشتمل ہے۔ جب انہوں نے ۶۲ء کے قریب اینٹی غزل کی بنیاد رکھی تو اس غزل میں بھی اُن کے وہ تجربات کام کر رہے تھے جو انہوں نے کلاسیکی شعراء کے تتبع سے سیکھے تھے۔

یہ دونوں رنگ اُن کے اوّلین مجموعہء غزلیات "بیاض" میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ اس دور میں سلیم احمد نے اُردو غزل میں واسوخت اور ہجویہ شاعری کے رنگوں کی آمیزش کا تجربہ بھی کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبیؔ کے الفاظ میں۔ "اس دور کی غزلیں کسی کلاسیکی شاعر کے دیوان میں رکھ دی جائیں تو انہیں پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔" ۴؎

۴۰ء کے دہے میں ہندوستان بھر میں یگانہؔ کا شہرہ تھا۔ اُن کی راہنمائی میں غزل کہنے والوں کی ایک نئی کھیپ پیدا ہونے کے امکانات روشن ہو رہے تھے۔ سلیم احمد نے یگانہؔ کا رنگ اختیار کیا تو اُن کی شاعری میں بھی زندگی کا جبروتی رُخ ہویدا ہونے لگا۔ فراقؔ نے لکھا ہے۔ "غزل کو جواب

تک حسن وعشق کی شاعری سمجھی جاتی رہی ہے۔ یگانہ نے زندگی کی شاعری بنا دیا۔" سلیم احمد کی رنگِ یگانہ میں کہی ہوئی غزلوں سے دو اشعار دیکھیے۔

اب رہیں شاد یار ہیں ناشاد
کر لیا عشق ہر چہ بادا باد
کیا جھوٹ کیا سچ اللہ جانے
جتنی زبانیں اتنے فسانے

اگرچہ تنقید میں بھی رنگِ یگانہ نے سلیم احمد کو متاثر کیا اور انہوں نے یگانہ کی "غالب شکنی" کی روایت میں "غالب کون؟" لکھی لیکن شاعری میں یگانہ کے ساتھ ساتھ انہوں نے غالب کا رنگِ سخن بھی اپنایا۔ چند اشعار دیکھیے۔

حسن جب سے ہوا ہے کم آزار
عشق بھی بن گیا ہے دنیا دار
گو نہ غالب کو ہو ہمیں تو ہے
ذوقِ آرائشِ سر و دستار
بس بہت ہے یہ اعتراف سلیم
وَ قِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

اُن کے نزدیک فراق تہذیب عشق وحسن کا شاعر ہے۔ وہ میر کے بعد فراق کو سب سے بڑا شاعر گردانتے ہیں۔ فتح محمد ملک کے بقول۔ "فراق کی آواز اُردو شاعری میں تہذیبی رچاؤ اور غزل کی آبرو کی علامت ہے۔ سلیم احمد نے فراق سے "تخلیقِ عشق اور شائستگی غم" کا درس لیا ہے۔"[۵]

سلیم احمد نے فراق کے رنگ میں کہا ہے۔

آئے جا آج اہلِ درد کو یاد
جانے پھر کب ملے یہ فرصتِ غم

وہ اُردو کے کھرّے غزل کے عاشق، حسرتؔ موہانی کے بھی چاہنے والے ہیں۔ اندازِ حسرتؔ میں اُن کا شعر دیکھیے۔

کس طرح ثابت کریں اُس بدگمان شوق پر
غم کی وہ شدّت جو اُس کے رُوبرو باقی نہیں

سلیم نے غالبؔ کے ساتھ ساتھ حالیؔ سے بھی تنقیدی روّیوں میں تو اختلاف کیا ہے لیکن مضامین غزل اور اسلوبِ غزل میں حالیؔ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ایک شعر رنگِ حالیؔ میں دیکھیے۔

غم ہائے تازہ مانگتے ہیں آسماں سے ہم   رکھتے ہیں لاگ اپنے دلِ شادماں سے ہم

اسی طرح درج ذیل اشعار میں آتشؔ اور مصحفیؔ کی زمینوں میں طبع آزمائی کی گئی ہے جو اُن کے اوّلین دورِ غزل گوئی کی کاوشوں کو ظاہر کرتی ہے۔

کس انجمن گل کی لگن ہے کہ چمن میں
نکلا ہی نہیں پاؤں نسیمِ سحری کا

(انداز مصحفیؔ)

سخت دل تنگ ہوئے گوشۂ تنہائی میں
چھاؤنی چھائیں گے اب کوچۂ رسوائی میں

(انداز آتشؔ)

سلیم احمد تنقید میں تو بقول شخصے "لگاؤ" سے زیادہ "لاگ" کے قائل نظر آتے ہیں لیکن شاعری میں اپنے اپنے مقام پر لگاؤ اور لاگ دونوں طرح کے مضامین کو کمال ہنر مندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ مولانا حالیؔ اور سلیم احمد کی غزل گوئی فرقِ مراتب اور اپنی نوعیت اور اختلاف کے باوجود ایک ایسے موڑ سے گزری ہے (۱۸۵۷ء حالیؔ۔ ۱۹۴۷ء سلیم احمد) جہاں پرانا شاعر اپنے آپ کو چھوڑ کر ایک نئے آفاقی شاعر کے ساتھ نئی اخلاقیات کی تلاش میں روانہ ہو جاتا ہے۔

عسکری صاحب سلیم احمد کی ادبی وشعری اُٹھان سے اس قدر متاثر تھے کہ اُنہوں نے اپنے ایک کالم کا اختتام سلیم احمد کے ایک شعر سے کیا۔

ازل سے گوش بر آواز پا ہیں ویرانے

جنوں کی کونسی منزل میں اب ہیں دیوانے

سلیم احمد نے اپنے پہلے مجموعہ غزلیات "بیاض" کا انتساب حسن عسکری کے نام کیا ہے ادھر عسکری صاحب نے بھی سلیم احمد کے اس دورِ غزل گوئی کو اُن کا بہترین دور کیا ہے۔ یہ اسی دور کا شعر ہے۔

اے صبا آ کر دکھائیں تجھے وہ گل جس نے

باتوں ہی باتوں میں گلزار کھلا رکھا ہے

اسی دور کے حوالے سے سلیم احمد یہ اعتراف کرتے ہیں۔ "عسکری صاحب نے ۴۷ء میں تین شاعروں کو متعارف کرایا تھا۔ ناصر کاظمی، جمیل الدین عالی اور میں۔ بعد میں وُہ سب سے مایوس ہوتے چلے گئے اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ صرف مجھے اپرو (Approve) کرتے تھے اس وقت ان کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ میری غزلیں وہ اپنے ہاتھ سے نقل کرتے تھے اور لوگوں کو بھیجتے تھے۔"٦

اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنی مختلف آوازوں بلکہ بعض اوقات متضاد آوازوں کی آمیزش سے سلیم احمد کی اپنی آواز ابھر نہیں سکی لیکن یہ بات اُن کے اسی مخصوص دور سے متعلق ہے۔ وہ دور جو اُن کے لئے ایک عبوری اور تشکیلی دور تھا۔ اس میں کہیں کہیں اُن کا وہ لہجہ بھی چمک اٹھتا ہے جو آگے چل کر اُن کی پہچان بننے والا تھا۔ مثلاً "بیاض" ہی میں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں۔

دل زندہ کی جتنی داستانیں ہیں ہماری ہیں

کتابِ عشق میں شامل ہیں جتنے باب، اپنے ہیں

اپنی حدودِ ذات سے اپنی ہی سمت ہوں رواں

آپ ہی میرِ کارواں آپ ہی گردِ کارواں

جہاں تک اینٹی غزل کا تعلق ہے یہ کم وبیش پچیس غزلوں پر مشتمل ہے جو بیاض کی کُل غزلوں کا ایک چوتھائی حصہ ہیں لیکن ان غزلوں نے ادبی دُنیا میں واقعۃً ایک تہلکہ مچا دیا۔ بعض ثقہ بزرگ تو لٹھ لے کے دوڑ پڑے۔ بات صرف اتنی تھی کہ سلیم احمد نے غزل کے کومل لہجے اور مخصوص رموز و

علائم سے ہٹ کر طنز کی شدید کاٹ کے ساتھ عصری منافقتوں کا پردہ چاک کر دیا تھا۔ جب غزل کی نرم روی کارگر نہ ہوئی تو شاعر نے گرم روی اختیار کر لی کیونکہ سلیم احمد کے بقول۔

آ کے اب جنگل میں یہ عُقدہ کھُلا بھیڑیے پڑھتے نہیں فلسفہ

سلیم احمد نے جہاں اپنے قاری سے بالغ اور نڈر ہونے کا تقاضا کیا ہے وہاں انہوں نے اس منشور کا اعلان بھی کیا کہ میں چاند بادل اور دریا کے الفاظ استعمال کرنے کو شاعری نہیں سمجھتا۔

"بیاض" کی اس باغیانہ شاعری کے بارے میں فتح محمد ملک نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ "بیاض کی شاعری غزل کی نفی ہو یا نہ ہو، ہماری شاعری اور معاشرت کے رائج الوقت چلن سے بغاوت ضرور ہے۔ "مظفر علی سیّد نے طنزیہ انداز میں لکھا۔ "سلیم صاحب غزل گوئی فرماتے ہیں اور اس میں منٹو کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ "ے

سلیم احمد نے جس باغیانہ غزل سے دنیائے شاعری میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا تھا، اُس کے ابتدائی رجحانات انشاء اللہ خاں اور مرزا رفیع سودا کے ہاں بھی ملتے ہیں لیکن ان کے ہاں مزاح کا رنگ زیادہ ہے۔ اس مزاحیہ رنگ میں کبھی کبھی ابتذال کا رنگ بھی در آتا ہے۔ سلیم احمد کے ہاں مزاح سے زیادہ طنز کی کاٹ نمایاں ہے۔ یہ ہمارے تہذیبی بحران پر ایک تخلیقی طنز ہے۔

پوچھتا کون ہے محبت کو
گرم اہلِ ہوس کا ہے بازار
عشق میں کھو کے عزتِ سادات
میرؔ کی طرح کیوں پھریں ہم خوار

اس باغیانہ غزل میں رنگِ مزاح بہت کم ہے مگر جہاں یہ رنگ آیا ہے، بصیرت افروزی کا موجب بنا ہے، جیسے

ہم تو سو جھوٹ بھی بولیں وہ اگر ہاتھ آئے
کوئی ٹھیکہ تو اُٹھایا نہیں سچائی کا

اُن کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی، انہیں اعلیٰ اقدار و روایات کا پاس تھا۔ وضعداری اور

کلاسیکی رکھ رکھاؤ اُن کا خاندانی ورثہ تھا۔ پاکستان بنا تو نوجوان سلیم احمد خوابوں، آدرشوں اور اپنی تحریکِ پاکستان کے لئے جدوجہد کے ساتھ نئی سرزمین پر وارد ہوئے۔ اُن کے بقول اوّل تو لاہور ہی میں مہاجرین کی ٹرین کو رُکنے نہ دیا گیا، پھر شہر کراچی کی نفسانفسی اور اس بڑے شہر کے عذابوں نے سلیم احمد کے خواب محل چکنا چور کر دیئے۔ اس پس منظر کے ساتھ اُن کی اندرونی ترکیب، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے بقول یُوں تھی۔ "سلیم احمد مزاجاً رومانی، وضعاً کلاسیکی اور فکری لحاظ سے عینیت پسند تھے۔"[۸]

کھنچ رہیں رگیں تشنج سے
دُکھ رہا ہے بدن کا اک اک تار
بستیاں شوق کی ہوئیں ویراں
قلعے خوابوں کے ہوگئے مسمار

اس صورت حال میں "مکمل عشق" کے لئے کسی کے پاس طاقت ہے نہ وقت۔ اگر سلیم احمد یہ کہہ دیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔

اُس نے کہا سلیمؔ ابھی پیار مت جتاؤ
مہکیں گے خود ہی پھول انہیں عطر مت لگاؤ
میں تم یہ رات ہائے کوئی جاوداں نہیں
جلدی سلیمؔ پیار کرو، وقت مت گنواؤ

اس دور میں غزل، فراقؔ گورکھپوری تک عہد جدید کے اثرات کو سموتی ہوئی ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی، جہاں قدیم طرز احساس سے بیگانگی کا عمل زور پکڑ گیا تھا۔ اس مقام پر سلیم احمد نے اپنی ذات کے بل پر عہد جدید کے اثرات (خود رحمی، رقت انگیزی اور جذبات پرستی وغیرہ) کی نفی کر کے ایک ایسا طرز عمل پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں سرشاری، خوشدلی اور نشاط انگیزی کے اثرات نمایاں ہوں۔

"بیاض" میں کم وبیش بارہ چودہ غزلیں ایسی ہیں جن میں سلیم احمد اپنے اس مقصد میں کامیاب

نظر آتے ہیں لیکن اچانک یہ سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور سلیم احمد شعوری طور پر روایت سے بغاوت کرتے ہیں۔ اس باغیانہ غزل میں جو ۱۹۶۲ء کے لگ بھگ شروع ہوئی، غم وغصہ، طنز ومزاح، روتے روتے ہنس پڑنے یا ہنستے ہنستے رو پڑنے کی کیفیتیں ملتی ہیں۔ یہ غزل ذہن کو بری طرح جھنجھوڑتی ہے اور ردِ عمل پیدا کرتی ہے۔

دل کی حالت یہ ہوئی درسِ خودی اپنا کر   مصرعہ خشک ہو جیسے کسی اقبالی کا
لائیے زہر بھی پی لیں مگر اتنا کیجئے   درس کم دیجئے سقراط کی نقالی کا
وہ بھیڑ اہلِ حق کی کہ اللہ تری پناہ   جیسے ہر ایک گام پہ آیات کی دکاں
ہاں اُسے قدر نہیں وہ نہیں قائل دل کا   عشق پھر جا کے اُسی کوچے میں مرتا کیوں ہے؟
عشق نے کب سے توقع پہ لگا رکھا ہے   روز کہتا ہے کہ بس کام بنا رکھا ہے
عشق اور اتنا مہذب چھوڑ کر دیوانہ پن   بند اُوپر سے تلے تک شیروانی کے بٹن

اسلوب کے اعتبار سے بھی سلیم احمد نے روایتی اندازِ بیان کو ترک کر دیا۔ اس اینٹی غزل میں نئے الفاظ، نئے تلازمات اور نئے استعارات وعلامات ہیں۔ اس نئے لہجے نے اُس دور کے بہت سے شعراء کو متاثر کیا۔ یہ اُردو غزل کا نیا رُخ تھا۔ ان غزلوں کے آہنگ میں وہ کڑک اور وہ بے باکی ہے جو اونگھتی ہوئی روح کو جگانے کا کام کرتی ہے۔

جنہیں کل عشق بننا ہے وہ جذبے
نظر کی رشوتوں پر پل رہے ہیں
جانے کیا بول اُٹھے دل کا ٹھکانہ کیا ہے
ایسے وحشی کو تو پہلے سے پڑھا کر لاتے
عاشقی بن گئی تھی رسمِ کہن
ہم نے ڈالی مگر نئی بنیاد
اب کے تیشہ چلے گا خسرو پر
جوئے خوں اب کے لائے گا فرہاد

اس اینٹی غزل کے جواز اور عدم جواز پر بڑی بحثیں ہوتی رہی ہیں لیکن یونگ جیسے ماہر نفسیات کے خیال کے مطابق اِس شاعری کا جواز وہی ہے جو سلیم احمد نے اپنایا یعنی اپنی انا، اور آورشوں کی شکست کے ردِ عمل کے طور پر معاشرتی تضادات کو گرفت میں لینا اور انہیں ایک زہر خند ہنسی کے ساتھ پیش کرنا۔

جہاں تک "بیاض" کی شاعری پر "جنس" کی تشہیر کا الزام ہے تو اوّلاً یہ چار پانچ اشعار سے زیادہ اشعار میں نہیں ہے۔ ثانیاً جنس کا یہ بیان فنکارانہ اور ادبی ہے نہ کہ واشگاف طریقے سے۔ یوں بھی اب جبکہ کئی برس بعد بہت سا پانی وقت کے پلوں سے بہہ چکا ہے، جنس کا ایسا بیان زیادہ قابلِ مواخذہ نہیں رہا۔ نت نئے ذرائع ابلاغ نے بہت سے تصورات کو بدل ڈالا ہے۔

یہ تجرباتی دور کہا جاسکتا ہے۔ "بیاض" کی غزلیں اپنی قوت اور سچائی کی وجہ سے پڑھنے والوں کو تادیر یاد رہیں گی۔

سلیم احمد کی اپنی آواز "اکائی" کی غزلوں میں زیادہ نمایاں اور صاف طور پر سُنی جاسکتی ہے۔ "بیاض" کے آخری دنوں میں باغیانہ غزل کو ترک کر کے بڑی تیزی سے اپنی آواز کے تعاقب میں نکلے تھے۔ "بیاض" میں درج ذیل اشعار اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کا خالق اب کسی اور سفر پر روانہ ہونے والا ہے۔

اپنی رفتار پہ آجائیں تو کیا موجِ ہوا
اور تھم جائیں تو ٹھہرا ہوا دریا کیسا؟

گو آج نہیں آئے وعدہ تو ہے آنے کا
لازم تو نہیں ایسا ہر بار کئے جائیں

سلیم احمد کا یہ نیا سفر بغاوت کا روّیہ ترک کر کے مصالحت اور ہم آہنگی کا سفر ہے، یہ جگرِ لخت لخت کی بجائے "اکائی" اور وحدت کی طرف پیش قدمی ہے۔ یہ اپنے ٹوٹے اور بکھرے ہوئے حصّوں کو پانے اور جوڑنے کا سفر ہے۔ وہ جن عناصر کی نفی کر کے "اینٹی غزل" تک پہنچے تھے، ان کے اثبات کا عمل پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ گویا ان غزلوں کے ساتھ ہی سلیم احمد کے تخلیقی سفر کا ایک دائرہ مکمل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق "یہ وہ مخصوص لہجہ ہے جس نے غزل کی

روایت میں اضافہ کیا ہے اور جو تاریخِ غزل میں سلیم احمد کی پہچان ہے۔"

یہ لہجہ مخصوص کلاسیکی رچاؤ سے مزین ہے۔ یہاں زندگی کے گھمبیر مسائل ہیں۔ کچھ سوالات ہیں اور کچھ جوابات کچھ وسوسے ہیں اور کچھ غم وغصہ۔ ٹین ایجرز کے لئے اس لہجے میں چاشنی شاید کم ہے کیونکہ یہ "میٹھے برس" سے شروع ہو کر جلد ٹھکانے لگ جانے والی شاعری نہیں ہے۔ سلیم احمد نے عیبِ عشق کو ہنر بنا دیا ہے۔

جانکاہیوں میں عمر کو اپنی بسر کیا
جینا کہ عیب عشق تھا ہم نے ہنر کیا
نیا مضموں کتابِ زیست کا ہوں
نہایت غور سے سوچا گیا ہوں

جاذب قریشی کا خیال ہے۔ "اِن غزلوں میں جمالیاتی اور تہذیبی خدوخال کے ساتھ تصوف کی ہم آہنگی بھی موجود ہے۔"

یاں فتح سبب ہے سرکشی کا
تُو ہار کے سرفراز ہو جا

احمد ندیم قاسمی نے بھی "اکائی" کی غزلوں میں تصوف کی اُس چاشنی کو محسوس کیا ہے۔ "اکائی" کی غزلیں پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ سلیم احمد اس دور کا شاید پہلا شاعر ہے جس کے یہاں تصوف اور روحِ عصر نے ایک متوازن ملاپ حاصل کر لیا ہے۔ زندگی کی روشنیوں اور ماورا کی دھندلاہٹوں نے مل کر ان کے شعر میں دھوپ چھاؤں کی سی عجیب طلسمی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ 9

"اِن غزلوں میں سلیم احمد کی خود آگہی اور عصری آگہی دیدنی ہے۔

اسرار تمام کُھل رہے ہیں
تُو اپنے لئے بھی راز ہو جا
اُس آنکھ سے سیکھ رازِ عصمت
کُھل کھیل کے پاکباز ہو جا

اسے سنبھال کے رکھو خزاں میں لو دے گی
یہ خاکِ لالہ و گُل ہے کہیں ٹھکانے لگے

خود اپنی آگ سے تُو جی اٹھے شرر کی طرح
یہ معجزہ ابھی اے کائنات باقی ہے

چونکا تھا کیسے خواب سے کل رات میں سلیم
لیکن بحال ہو گیا دل تجھ کو پا کے ساتھ

اس دور کی غزلوں میں سلیم احمد نے آنکھ اور چشم کا استعارہ بار بار استعمال کیا ہے اب شاعر باہر کی آنکھ سے زیادہ اندر کی آنکھ پر بھروسہ کرتا ہے۔

یہ خواب اور دیکھیں گے رات باقی ہے
ابھی تو اے دلِ زندہ حیات باقی ہے

کس کی جانب نگراں ہیں مری بے خواب آنکھیں
کیا کوئی مرحلہء عمرِ رواں باقی ہے ؟

ان غزلیات میں صدا اور آواز کی تکرار بھی بہت کچھ کہے دیتی ہے۔

اک وادی سکوت میں تجھ کو پکارتا
میں دو ر جا رہا ہوں خود اپنی صدا کے ساتھ

اس دور میں سلیم احمد کے ہمعصر شعراء بھی انہی مسائل کو موضوعِ سخن بنا رہے تھے، جن سے سلیم احمد نبرد آزما تھے۔ مختلف ہمعصروں کی تخلیقات کا تقابلی مطالعہ کئی دلچسپ پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے ۔مثلاً سلیم احمد اور منیر نیازی کے دو اشعار میں ایک ہی موضوع بیان ہوا ہے لیکن دونوں کی ٹریٹمنٹ الگ الگ ہے ۔"زہروان شوق" اور" آسیب کا سایہ" سے دونوں فنکاروں کی تخلیقی اُپج کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے۔

کس راہ سے گئے ہیں تیرے رہروان شوق
پہنچے تو دُور اور سفر مختصر کیا

(سلیم احمد)

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

(منیر نیازی)

ایک دو پل کے لیئے ہوں تیری دیوار کی دھوپ
شام ہوگی تو اندھیروں میں اُتر جاؤں گا
میں نے سوچا تھا جلاؤں گا صداقت کے چراغ
کیا خبر تھی کہ ہوا دیکھ کے ڈر جاؤں گا۔

(سلیمؔ احمد)

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا
زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ
بُجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

(احمد ندیم قاسمی)

"بیاض" اور "اکائی" کی غزلوں میں ایک اور نمایاں فرق شاعر کے کربِ تنہائی کے حوالے سے بھی ہے۔ پہلے وہ گردابِ تنہائی کا شکار تھا مگر اب وہ اپنوں کی محفل میں ہے۔ "بیاض" میں وہ اس قدر مردم بیزار تھا کہ اُس نے اپنی کتاب کا پیش لفظ اِن لفظوں میں لکھا۔ "میں نے یہ کتاب ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لئے نہیں لکھی۔" لیکن "اکائی" کا انتساب "طاہرہ بیٹی کے نام" ہے۔ ان غزلوں میں وہ گھر گرہستی اور بچوں کو اپنی شاعری کا اہم استعارہ بناتے ہیں۔

سلیم نغمہ بجاں ہوں فغاں کے موسم میں
عجیب پھول کھلے ہیں خزاں کے موسم میں

سلیم احمد کی شاعری کا یہ تیسرا دور اُن کے فکری وفنی ارتقاء کے واضح فرق کو بیان کرتا ہے۔ اِس دور کی غزلیات جہاں "بیاض" کی غزلیات کے مقابلے پر اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں وہاں اُن کے آنے والے دور کی نشاندہی بھی کرتی ہیں۔ شب رقص جنوں کرنا اور صبح کو جل جانا۔ پروانوں

کے جلنے کا اسلوب پسند آیا۔

ایک لحاظ سے "اکائی" کی غزلیات کچھ امتزاجی کیفیت بھی رکھتی ہیں یعنی ایک طرف "بیاض" کلی رنگ جھلکتا ہے اور دوسری طرف شاعر کے آخری مجموعہ غزلیات، چراغ نیم شب کا عکس بھی اس میں نظر آتا ہے۔

اک بگولے کی طرح مجھ کو لئے پھرتی ہے
جانے کیا شے ہے جو بیتاب مری خاک میں ہے

چراغ ایک ایسا استعارہ ہے جو نہ صرف "اکائی" میں متعدد بار آیا ہے بلکہ آگے چل کر سلیم احمد کے تیسرے مجموعہ غزلیات کا عنوان بھی بنا۔

سب مجھ کو جلا کے سو گئے ہیں
میں ایک چراغ نیم شب ہوں

تخلیقی اعتبار سے سلیم احمد کی شاعری کے اس تیسرے دور (۸۰۔۱۹۷۰ء) کا پہلا حصہ کچھ بے کیفی کا رہا ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ "چراغ نیم شب" میں ۱۹۸۲ء سے اگست ۱۹۸۳ء تک کی غزلیں شامل ہیں۔ بہر حال یہ سلیم احمد کا یہ وہ کلام ہے جس میں انہوں نے اپنی الگ شناخت پیدا کر لی ہے۔ شمیم احمد کے بقول "چراغ نیم شب" کی غزلیات میں انہوں نے میرے خیال کی حد تک اپنی اُس آواز کو پالیا تھ جس کے لئے انہوں نے طویل مسافت اختیار کی تھی۔ "۱۰

یہ سلیم احمد کی شاعری کا چوتھا اور آخری دور ہے جس میں اُن کی وہ منفرد آواز نمایاں ہے جو انہوں نے چوالیس سالہ ریاضت فن کے بعد حاصل کی ہے۔ "چراغِ نیم شب" کی غزلیں جس زمانے میں کہی گئیں وہ سلیم احمد کے نظریاتِ شعروفن اور تخلیقات کا اہم ترین زمانہ ہے۔ "میں تیرے جسم کو دیکھوں تو نیند آنے لگے (اکائی)" اور "میری زبان آتشیں لوتھی مرے چراغ کی" میں ایک واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔

سلیم احمد نے چراغ، چراغ نیم شب اور دیا کو متنوع معانی میں استعمال کیا ہے۔ روشنی کے یہ

تلازمات شاعر کے اندر پہلے پیدا ہونے والی اُس روشنی اور حرارت کا پتا دیتے ہیں۔ جس کی خاطر وہ چوبِ خشک ہو کر بھی آتشِ سوزاں سے محروم رہا۔ اب تو حال یہ ہے۔

مرے خوابوں پر جب تیرہ شبی یلغار کرتی ہے میں کرنیں گوندھتا ہوں چاند سے پیکر بناتا ہوں

یہ تیرے نقشِ قدم ہیں کہ ستارے ہیں کہ پھول تو گزرتا ہے تو رستوں میں دیئے جلتے ہیں

سلیم احمد کی یہ غزلیں اپنے طرزِ احساس اور لہجہ اُسلوب میں بالکل الگ چیز لگتی ہیں۔ ان میں بلا کی اثر پذیری اور تازگی ہے۔

دل کے اندر درد آنکھوں میں نمی بن جایئے
اس طرح ملئے کہ جزوِ زندگی بن جایئے
اک پتنگے نے یہ اپنے رقصِ آخر میں کہا
روشنی کے ساتھ رہیے روشنی بن جایئے
عالمِ کثرت نہاں ہے اس اکائی میں سلیم
خود میں خود کو جمع کیجئے اور کئی بن جایئے
کس پتے پر اسے تلاش کروں
شخص اک کھو گیا ہے برسوں سے

شاعری اگر کارِ پیغمبری ہے تو سلیم احمد کے دورِ آخر کی غزل میں اس کی گونج صاف سُنائی دیتی ہے۔ جب شاعر کا سامنا کسی سفاک، بے حس اور بے جہت معاشرے سے ہو تو شاعر کی ساری بشارتیں تیز ہوا کے شور میں گُم ہو جاتی ہیں۔ سلیم احمد کی ایک غزل میں تیز ہوا کی سفاکی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

جانے کسی نے کیا کہا تیز ہوا کے شور میں
مجھ سے سُنا نہیں گیا تیز ہوا کے شور میں
جیسے خروشِ بحر میں شورِ پرند ڈوب جائے
ڈوب گئی مری صدا تیز ہوا کے شور میں

میں بھی تجھے نہ سُن سکا ، تو بھی مجھے نہ سُن سکا
تجھ سے ہوا مکالمہ تیز ہوا کے شور میں
کشتیوں والے بے خبر بڑھتے رہے بھنور کی سمت
اور میں چیختا رہا تیز ہوا کے شور میں

سچا شاعر تیز ہوا کے باوجود اپنا چراغ جلائے رکھتا ہے۔ مگر یہ اُس شاعر کا وصف ہے جسے عرفانِ ذات اور عرفانِ کائنات حاصل ہو۔ "چراغِ نیم شب" کی غزلوں میں ایک ارفع زندگی کا ڈھب اور ایک تخلیقی زندگی کا نصب العین موجود ہے۔

میں تہ نشیں تھا کہ باقی تھی زندگی مجھ میں
جو مر گئے تھے انہیں موج نے اُچھالا تھا
وہ گم ہوا تو مضامین ہو گئے بے ربط
وہی تو تھا جو مرا مرکزی حوالہ تھا

گھر، بچے اور مائیں اس دور کی غزلوں کے خصوصی کردار ہیں جو جسم و جاں کی اکائی پیدا ہونے کے بعد چراغِ درونِ خانہ بن کر روشنی دیتے ہیں۔

آنچل میں چراغ جل رہے ہیں
بچوں کو بُلا رہی ہیں مائیں
ہونٹوں پہ دھوئیں کی تہ جمی ہے
سینے میں سُلگ اٹھی دعائیں

"بیاض" میں سلیم احمد نے کہا تھا کہ وہ چاند، بادل اور دریا کے الفاظ استعمال کرنے کو شاعری نہیں سمجھتے لیکن "چراغِ نیم شب" میں جگنو، پھول، ستارہ اور پرندے کی علامات بکثرت استعمال ہوئی ہیں۔

سوئے نہیں مدّت سے مرے شہر کے بچے
جیسے ہوں کسی خوف سے بیتاب پرندے بچوں کے لئے

حیرت پرواز نہیں ہے

اس شہر میں مدت سے ہیں نایاب پرندے

"چراغ نیم شب "میں کچھ ایسی غزلیات بھی ہیں جو سلیم احمد نے اپنی وفات سے پہلے مختلف رسائل کو اشاعت کے لئے بھجوائیں لیکن یہ غزلیں اُن کی وفات کے بعد شائع ہوسکیں۔ایک ایسی ہی غزل جو غالبؔ کی زمین میں ہے،فنونؔ میں بھی شائع ہوئی۔زمین غالب کی اور رنگ سلیم احمد کا ہے۔

دونوں ساتھی ہیں کسی ایک قید سے بھاگے ہوئے

میرا تیرا ربط ہے یا جبر ہے زنجیر کا

بے خیالی میں لکیریں کھینچتا رہتا تھا میں

جانے کیسے بن گیا خاکہ تری تصویر کا

جانے کیسا خواب دیکھا تھا لڑکپن میں سلیم

منتظر رہنا پڑا ہے عمر بھی تعبیر کا

سلیم احمد نے ناصرؔ کاظمی کی زمین میں بھی ایک غزل لکھی ہے۔یہ ایک ہمعصر کا دوسرے ہمعصر کو خراج تحسین ہے۔یہ غزل ناصرؔ کی وفات کے بعد کہی گئی۔

یہ راہ طلسم عشق کی ہے

ملتی ہیں بڑی بڑی بلائیں

اس شو ر کے با وجود دن بھر

کرتا ہے یہ شہر سائیں سائیں

"چراغِ نیم شب" میں سلیم احمد کا درج ذیل شعر خود ستائی نہیں بلکہ حقیقت اور سچائی کا عکاس ہے۔

نئے ستارے مری روشنی میں چلتے تھے

چراغ تھا کہ سرِ راہ جل رہا تھا میں

واقعۃً بہت سے نئے ستارے سلیم احمد کے منبع شعر وسخن سے روشنی پاتے رہے۔کچھ تو عمر بھر

بلکہ مرنے کے بعد بھی سلیم احمد کی محبتوں کے امین رہے جبکہ کچھ نے "بڑبولے پن" کا ثبوت مہیا کیا۔ اِن میں سے افتخار عارف وہ باصلاحیت شاعر ہے جو زندگی میں بھی اور سلیم احمد کی موت کے بعد بھی اُن کی عظمتوں کا معترف رہا۔ افتخار عارف کا ایک شعر دیکھئے جو سلیم احمد کے درج ذیل شعر میں ادا کیے گئے مضمون کو ایک نئے اسلوب میں بیان کرتا ہے۔

آدمی خود اپنے اندر کربلا بن جائے گا
سارے جذبے خیر کے نیزوں پہ سر ہو جائیں گے۔

(سلیم احمد)

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوکِ سناں پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

(افتخار عارف)

سوال یہ ہے کہ سلیم احمد نے اُردو غزل کو کیا دیا ہے؟ غزلوں کے ڈھائی تین مجموعے! اور بس۔ اُن کے مقابلے پر نجانے کیسے کیسے شعراء نے کتنی وافر مقدار میں اپنے گراں بہا کلام سے اُردو غزل کا دامن مالا مال کیا ہے۔ اُن میں سے کتنے ہیں جن کے نام سے بھی لوگ واقف ہیں؟ اِدھر ایک مرزا غالب ہیں کہ مختصر سے اُردو دیوان کو لے کر محفلِ غزل کے صدر نشیں بنے بیٹھے ہیں۔ گویا فیصلہ مقدار نہیں معیار پر ہوتا ہے، پھر یہ بھی ہے کہ عظمت کے معیار بھی تو بدلتے رہتے ہیں۔

اُردو شاعری میں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد کسی کا چراغ جلے تو کیوں کر جلے؟ بعض لوگ فیضؔ کا نام لیتے ہیں۔ اس طرح ناصرؔ تھے اور فرازؔ و ندیمؔ ہیں اور کتنے ہیں کہ عمر بھر کی ریاضتِ فن کے ساتھ سندِ قبولیت کے طلب گار ہیں۔ بہت سے ہیں کہ کسی دوسرے جینوئن شاعر کے خون پر پلتے ہیں اور بڑے کہلاتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو اپنی زندگی ہی میں ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کے مقالات کا موضوع بن کر "امر" ہونے کی کوشش میں ہیں۔

اِس صورتِ حال میں اگر مرنے کے بعد کسی شاعر کے دو چار مصرعے یا ایک آدھ شعر ہی لوگوں کے ذہن میں رہ جائے تو اُس کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ بلاشبہ سلیم احمد کے کئی شعار اور

کئی مصرعے ایسے ہیں کہ جو تادیر گفتگوؤں میں حوالے بن کر آتے رہیں گے۔ اس کی ایک مثال ساقی فاروقی جیسے سخت گیر نقاد کا وہ انتہائی کڑا انتخاب ہے جو انہوں نے سلیم احمد کی شاعری سے کیا ہے۔ (اس کی تفصیل بابِ دوم میں آچکی ہے)

غزل گو کی حیثیت سے سلیم احمد کی شہرت اور مستقبل کا دارومدار اُن کے تین مجموعہ ہائے غزلیات پر ہے۔ اِن میں سے بیاض کی غزلیں کچھ متنازعہ فیہ رہی ہیں مگر افسوس کہ اس کتاب کو صحیح طور سے شائع اور تقسیم نہیں کیا گیا۔ اگر یہ کتاب ازسرِنو شائع کی جائے تو اِس میں ایسے عمدہ اشعار بھی ہیں کہ سلیم احمد پھر سے جی اُٹھیں گے۔

"اکائی" کی غزلوں کی اثر آفرینی کا اعتراف احمد ندیم قاسمی، ساقی فاروقی، جمیل جالبی، فتح محمد ملک اور مجتبیٰ حسین جیسے ناقدین کر چکے ہیں۔ "چراغِ نیم شب" میں سلیم احمد اپنی اُس آواز میں بولے ہیں جس کے لئے انہوں نے بہت سے جوکھم اُٹھائے ہیں۔ اس آواز کی گھمبیرتا اور تاثیر وقت کی لہروں پر سفر کرتی رہے گی۔

مانا کہ سلیم احمد زندگی میں پی آر رکھتے تھے لیکن موت کے بعد تو ایسا ممکن نہیں۔ اگر موت کے بعد بھی اہلِ سخن سلیم احمد کو یاد رکھتے ہیں تو یہ اُن کی حیاتِ جاودانی کی دلیل ہے۔ اس کے لئے ابھی گزرانِ وقت کا مزید انتظار کرنا ہوگا۔ بقول سلیم احمد۔

کتنے لکھنے والے اِس حسرت میں مٹی ہو گئے　　صفحۂ آبِ رواں پر نقش ہو تحریر کا
اِس سرے سے اُس سرے تک دوڑنا آساں نہیں　　میرے تیرے درمیاں اک دشت ہے تاخیر کا

سلیم احمد کی نظم

(حمد، نعت، نظم آزاد، نثری نظم، قطعات اور ثلاثی/ ہائیکو)

سلیم احمد کی نظمیں زیادہ تر اُن کے مجموعہ کلام "اکائی" میں شامل ہیں۔ ان کی تعداد ۸۰ ہے ان میں حمد و نعت بھی ہے، قطعات اور ثلاثی بھی۔ زیادہ تر آزاد نظم کی شکل میں ہیں۔ ان کا عرصہ

تخلیق (۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۱ء) تقریباً پندرہ برس ہے۔ ان برسوں میں سلیم احمد اپنی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز سے گزرے جن کا فنکارانہ عکس ان نظموں میں ملتا ہے۔

سلیم احمد کی ان نظموں کے بنیادی موضوعات ہیں۔ فلسفہ، مابعد الطبیعات، مذہب، نفسیات اور عمرانیات وغیرہ اور ان سب کے ساتھ اپنے قلب و روح کی واردات کی روشنی میں کُلّیت کی تلاش۔ عنوان "اکائی" بھی نہایت معنی خیز ہے۔ سب نظمیں اُن کے علم اور تجربے کا ایک خوبصورت اظہار ہیں سلیم احمد کی آزاد نظموں، قطعات اور ثلاثی کے موضوعات میں "مذہب اور محبت" دو اہم موضوعات ہیں مذہب کی محبت یا محبت کا مذہب سلیم احمد کی شخصیت اور شاعری کا جزوِ اعظم رہا ہے۔ چنانچہ "اکائی" کا آغاز جس نظم سے ہوتا ہے۔ وہ سلیم احمد کا نہ صرف ایک گہرا روحانی تجربہ اور وارداتِ قلبی ہے بلکہ اُردو میں لکھی جانے والی "حمد" میں ایک اہم اضافہ بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "ابھرتے سورج کی نرم کرنیں۔ فصیل شب کے حصار میں رقص کر رہی ہیں۔ یہ رقص آغازِ زندگی ہے۔"

سلیم احمد کے خیال میں اس ابھرتے سورج کی روشنی میں زمانہ عہدِ انکار سے گزر کر حیاتِ اثبات میں داخل ہو رہا ہے۔ دنیا نے "خدائے گُم کردہ" کو پالیا ہے۔ گویا اس صورت حال میں کہ جب مغرب میں خُدا کی موت کا اعلان کر دیا گیا ہے، انسان اور ادب کی موت کا اعلان بھی ہو چکا ہے۔ سلیم احمد لا سے اِلا اللہ کی طرف پھر سے ایک نئے سفر کا آغاز کر رہے ہیں۔

وہ جو قریبِ رگِ جاں ہے، جب شاعر اُسے حقیقتاً اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے تو نظم "دُعا" میں دُعا کہتا ہے۔ "خُداوندا! مجھے نانِ شبینہ دے، شکم کے دوزخی آزار سے مجھ کو بچا لے، روح کو تابندہ تر کر دے، کہ میں زندہ ہوں اس حرفِ شیریں سے، جو تو خود ہے۔"

"اکائی" کی اِن نظموں میں شاعر کے اندر تکمیل کی خواہش زور پکڑتی ہے۔ وہ اپنی روح اور بدن دونوں کو بیک وقت ترقی دینا چاہتا ہے کہ یہی عین فطرت ہے۔ "نئے امکاں کو صورت دے رہا ہوں، گرا گر خود در و دیوار اپنے، میں اپنے گھر کو وسعت دے رہا ہوں" (نیا امکان)

ان نظموں میں شاعر کا تخلیقی تجربہ بھی نظر آتا ہے اور اس کرب کا فنکارانہ اظہار بھی۔ نظم "جن" میں شاعر کہتا ہے کہ بچپن میں بوڑھوں سے سُنا تھا کہ لوگوں میں جن آتے ہیں۔ اُس کا خیال ہے کہ جنوں ہی کی طرح بعض لوگوں پر لفظ آتے ہیں۔ "جواُن کو بھگائے پھرتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں اپنے آپ نہیں کہتے ہیں، لفظ اُن سے کہلاتے ہیں۔" (جن)

فنکار کو یہ احساس شدّت کے ساتھ ستا رہا ہے کوئی شے مجھ میں مجھ سے بھی بڑی ہے لیکن باہر کی دنیا کا ماحول سازگار نہیں ہے۔

میں اپنے پاؤں کچھ پھیلا تو لیتا، مگر آفاق میں وسعت کہاں ہے؟

"محبت" کا تجربہ بھی سلیم احمد کے لئے ایک منفرد تجربہ ہے۔ جس عمر میں لوگ باگ کچی پکّی باتیں کرتے اور رومانیت کی دھند میں کھوئے رہتے ہیں۔ اُس عمر میں بھی سلیم احمد نے "موت" اور "چتا" جیسی نظمیں لکھیں اور "انقلاب، اے انقلاب، اے انقلاب" کے ترانے گائے۔ اس عمر میں سلیم احمد البتہ "سیاسی رومانیت" کے زیر اثر ضرور نظر آتے ہیں۔ اُن کے ہاں ایسی محبت کے آثار لڑکپن یا جوانی میں نظر نہیں آتے جن سے اس عمر کے لڑکے بالے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے انہوں نے اپنے آپ کو فکر و فلسفے میں کیموفلاج کر لیا تھا۔

شاعر سوچتا ہے کہ زمین کے مسائل ابھی حل طلب ہیں اور لوگ چاند پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ نظم "چاند پر نہ جاؤ" ایک نہایت پُر اسرار اور پیچیدہ نظم ہے۔ پہلی سطر میں شاعر نے ایک پُر اسرار فارمولا پیش کیا ہے۔

۳+۴۸+۲۴+۱۲+۶+۳

یعنی کُل دنیائیں۔۳، سارے سورج۔۶، اپنا سورج۔۱۲، اپنی زمین۔۴۸، یہ سب اعداد اور ان میں انا، ارادہ اور آگاہی کے تین اعداد مزید جمع کر دیئے جائیں تو جو عدد یعنی ۹۴ نکلتا ہے وہ ویرانیوں کا عدد ہے۔ بقول شاعر

اس کے بعد وہی ویرانہ ہے، جس میں ہونا اور نہ ہونا دونوں یکساں ہیں، اس ویرانے میں

جانے سے بہتر، اپنی زمیں پر مر جانا ہے۔ (چاند پر نہ جاؤ)

پورے آدمی کا جو تصوّر اُوپر کے دھڑ اور نیچے کے دھڑ سے مل کر متشکل ہوتا ہے، اُس کا خوبصورت شعری اظہار اِن نظموں یا قطعات کی صورت میں بھی ہوا ہے۔ جیسے

زمانہ نوکری گھر فکرِ دنیا
یہ رنگینی کا افسانہ نہیں ہے
تجھے چاہا ہے پورے جسم و جاں سے
محبت کا الگ خانہ نہیں ہے

(میری محبت)

اس طرح درج ذیل نظم کا اسلوب تازہ اور انمول ہے۔ " کچھ لوگوں پر لفظ آتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں اپنے آپ نہیں کہتے ہیں، لفظ اِن سے کہلاتے ہیں۔ "

" مشرق " سلیم احمد کی طویل ترین نظم ہے۔ یہ کئی ذیلی نظموں سے مل کر متشکل ہوئی ہے۔ اُردو کی طویل نظموں میں یہ ایک اہم اضافہ ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اِس نظم کو طویل نظموں کی روایت کے پس منظر میں دیکھا جائے۔

آزادی کے بعد پاکستان میں حمایت علی شاعر کی طویل نظم " کوریا سے بنگال تک " اور ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم " آدھی صدی کے بعد " اور جیلانی کامران کی نظم " نقشِ کفِ پا " اُردو کی طویل نظموں میں اہم اضافے ہیں۔ حال ہی جمیل الدین عالی کی طویل نظم " انسان " بھی شائع ہو چکی ہے۔

"مشرق"

سلیم احمد کہتے ہیں۔ " ۔۔۔ یہ نظم نہیں میری روح کا ایک رزمیہ ہے۔ "

اس نظم " مشرق " کا کینوس محض پینتیس سال پر ہی پھیلا ہوا نہیں ہے بلکہ مشرق کی ہزاروں سال سے جاری تہذیب کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ اس نظم میں خاص طور سے ہند اسلامی تہذیب کی روح بولتی ہے۔ سراج مُنیر نے اسے اُردو کی پانچ اہم ترین اور طویل ترین نظموں میں شمار کیا ہے۔

اُردو شاعری میں سلیم احمد کا مقام

اب آخری سوال یہ ہے کہ اُردو شاعری میں سلیم احمد کا مقام کیا ہے؟ بارہ تیرہ برس کی عمر میں ایک مثنوی سے شاعری کا آغاز کرنے والے سلیم احمد نے اپنی فنی زندگی کے ابتدائی پانچ سات سال نظم گوئی میں صرف کیے اس دوران میں انہوں نے غزلیں بھی لکھیں لیکن کم۔ پھر حسن عسکری نے انہیں کلاسیکی لہجوں کی بازیافت پر لگا دیا۔ کچھ لوگوں کے نزدیک یہ ایک جبری مشقت تھی۔

بیسویں صدی میں علامہ اقبال کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جل سکا۔ اُن کے بعد بھی فیضؔ، مجید امجدؔ، ناصر کاظمیؔ، راشدؔ، میرا جیؔ، فرازؔ، اختر الایمان، منیر نیازیؔ، احمد ندیم قاسمی اور بیسیوں دوسرے قد آور شعراء کے نام آتے ہیں۔ انہی میں سے ایک نام سلیم احمد کا بھی ہے۔ وہ جن مشکل راہوں سے گزر کر پانچ معیاری شعری مجموعے اُردو شاعری کو دے گئے۔ وہ ایک اچھے اور بڑے شاعر کی حیثیت سے اُن کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

ویسے ادب اور شاعری کا مجموعی لحاظ سے حال کچھ پتلا ہی ہے۔ ایک صدی پہلے مولانا حالیؔ نے بھی یہی بات کہی تھی "شاعری نئی ہو یا پرانی چلتی نظر نہیں آتی" سلیم احمد کی تنقید حالیؔ کے اس جملے کی تفسیر ہے اور شاعری ایک احتجاج۔ آنے والے زمانوں کے بارے میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ ذوقؔ کو چھوڑ کر غالبؔ کو سر پہ بٹھالے یا نظیرؔ اکبر آبادی کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر شہرت اور قبولیت کا تاج پہنا دے۔

فی زمانہ اگر کسی شاعر کے دو چار اشعار اور پانچ چھ مصرعے ذہنوں میں باقی رہ جائیں تو بہت غنیمت ہے۔ سلیم احمد کے کئی اشعار ایسے ہیں جن کا حوالہ لوگ دیتے رہتے ہیں۔

☆ شاید کوئی بندۂ خدا آئے — صحرا میں اذان دے رہا ہوں

☆ جانتا ہوں میں عمر کو اپنی بسر کیا — جینا کہ عیب عشق تھا ہم نے ہنر کیا

☆ نیا مضموں کتابِ زیست کا ہوں — نہایت غور سے سوچا گیا ہوں

☆ اتنی کاوش بھی نہ کر میری اسیری کے لئے — تو کہیں میرا گرفتار نہ سمجھا جائے

☆ نہ جانے کس کی آمد ہے کہ تارے — دو رویہ مشعلیں لے کر کھڑے ہیں

☆ میں تم، یہ رات ہائے کوئی جاوداں نہیں
جلدی سلیم پیار کرو وقت مت گنواؤ

☆ مجھے کچھ ایسی آنکھیں چاہئیں اپنے رفیقوں میں
جنہیں بے باک سچے آئینوں سے ڈر نہیں لگتا

☆ مرے خوابوں پہ جب تیرہ شبی یلغار کرتی ہے
میں کرنیں گوندھتا ہوں چاند سے پیکر بناتا ہوں

☆ میری زبانِ آتشیں لو تھی مرے چراغ کی
میرا چراغ چپ نہ تھا تیز ہوا کے شور میں

☆ اک برہمن نے یہ آ کے صحن مسجد میں کہا
عشق جس پتھر کو چھوئے وہ خدا ہو جائے گا

☆ تم تو دشمن بھی نہیں ہو کہ ضروری ہے سلیم
میرے دشمن کے لئے میرے برابر ہونا

☆ ہر دیا سوچتا ہے ساری عمر
رات کا سلسلہ کہاں تک ہے

☆ میں نے خواب جو دیکھے تھے میں لکھ لکھ ان کو ہار گیا
میرے بعد کا لکھنے والا خوابوں کی تعبیر لکھے۔

سلیم احمد بحیثیت کالم نویس

اُردو میں کالم نگاری کی روایت کم وبیش ایک سو سال پُرانی ہے۔ یہ بات کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ہندوستانی زبانوں کے کسی کالم نگار نے معاشرہ کی اتنی آئینہ داری نہیں کی جتنی اُردو کالم نگاروں نے کی ہے۔

تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے بعد ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی۔ پاکستان کے دو بڑے شہروں لاہور اور کراچی ہی سے زیادہ تر اخبارات ورسائل شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد چراغ حسن حسرتؔ، مجید لاہوریؔ، طفیل احمد جمالیؔ، ابنِ انشاءؔ، نصر اللہ خاںؔ، انعام درانیؔ، ابراہیم جلیسؔ اور احمد ندیم قاسمیؔ نے کالم نگاری میں طنز ومزاح کی آمیزش جاری رکھی اور شہرت پائی۔

اس کے ساتھ ہی سنجیدہ مزاج کالم نویس بھی سامنے آنے لگے۔ ان کے کالموں میں شگفتگی کا عنصر موجود تھا لیکن انہیں محض طنزیہ یا مزاحیہ کالم نگار نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں میاں محمد شفیعؔ، انتظار حسینؔ، عبدالقادر حسنؔ، رئیس امروہویؔ اور جمیل الدین عالیؔ کے نام شامل ہیں۔ انہوں نے فکاہی کی جگہ سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تجزیاتی اسلوب کو مقبول بنایا۔ زیڈ اے سلہری، پیر علی محمد راشدیؔ اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے بھی اس حوالے سے کافی مقبولیت حاصل کی۔

۱۹۷۰ء کے بعد سنجیدہ تجزیاتی کالم نگار کی حیثیت سے محمد صلاح الدین اور فکاہیہ کالم نگار کی حیثیت سے مشفق خواجہ، رفیق ڈوگر، ظفر اقبال، نذیر ناجی اور عطاء الحق قاسمی بہت مقبول ہوئے۔ سنجیدہ کالم نویسوں میں ارشاد احمد حقانی، ابن الحسن اور بریگیڈیر عبدالرحمٰن صدیقی کو کافی شہرت ملی۔

سلیم احمد کی کالم نگاری، ارتقائی سفر

کالم نگاری سلیم احمد کے فکر وفن کی ایک اہم جہت ہے۔ وہ جتنے بڑے نقاد یا شاعر تھے اتنے ہی اہم کالم نگار بھی تھے۔ وہ "نام مطلوب ہے تو کالم لکھ" کے فارمولے پر عمل پیرا نہ تھے بلکہ یہ اُن کی فکر کی ترسیل کا ذریعہ تھا۔ تاہم ابتداء میں انہوں نے بھی روایتی طنزیہ اور مزاحیہ انداز اختیار کیا تھا۔

سلیم احمد کی کالم نگاری کا آغاز ۱۹۶۶ء سے ہوتا ہے۔ وہ روزنامہ "حریت" کراچی کے ہفتہ وار ادبی گزٹ میں " کہتا ہوں سچ" اور "مجھے کچھ کہنا ہے" کے عنوان سے اپنے حالات وواقعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اب جبکہ تقریباً ہر بڑا اخبار ادبی میگزین یا ادبی صفحہ شائع کرتا ہے، یہ بات شاید اس قدر اہم نہ سمجھی جائے لیکن ۱۹۶۶ء میں یہ ایک اہم واقعہ تھا۔

حریت کے اِن کالموں میں سلیم احمد جس ذہانت، طباّعی اور نقطۂ نظر کی انفرادیت کا اظہار کرتے تھے۔ وہی آگے چل کر "سلیمیات" کی بنیاد بنا۔ اس میں کس قدر پختگی تھی، اِس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے ہوسکتا ہے۔ "روحانی اور مادّی ترقی کے بارے میں، میں نے جو سوالات اُٹھائے ہیں اِن کا سامنا دنیا کی اور قوموں کو جس طرح بھی کرنا پڑا ہو، پاکستان میں یہ سوالات اتنے پریشان کُن نہیں ہیں۔۔۔۔۔ہم اس بات پر بہت متفق ہو چکے ہیں کہ اس ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ بننا ہے۔ اب تو ہمیں ایک قدم آگے بڑھ کر سوچنا ہے کہ اسلام کی تجربہ گاہ بننے کے لئے اسے کن کن مسائل سے گزرنا ہوگا۔ یہی ہماری ترقی کی ابتدا ہوگی۔"

کچھ عرصہ بعد وہ ہفت روزہ "زندگی" میں اور دیگر ہفتہ وار جرائد میں، کبھی اصل اور کبھی قلمی ناموں سے لکھنے لگے۔ قلمی ناموں سے لکھنے کا سبب شاید ریڈیو پاکستان کی سرکاری ملازمت تھی۔ ۱۹۶۹ء۔۷۰ میں کراچی سے روزنامہ "جسارت" کا اجراء ہوا تو سلیم احمد اور شمیم احمد "جسارت" کے مستقل کالم نویس بن گئے۔

جب سلیم احمد "جسارت" میں لکھتے تھے تو اُس وقت صحافیوں کو موجودہ دور کے تشدّد کی طرح جان ضائع ہونے کا تو احتمال نہیں تھا لیکن حکومتِ وقت کی طرف سے دوسری بیسوؤں قسم کی

سختیاں برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ حکومت کے خوف سے سرکاری ملازمین "جسارت" کو اپنی میز پر رکھتے ہوئے خطرہ محسوس کرتے تھے۔ بھٹو حکومت ۷۷۔۱۹۷۱ء نے متعدد مرتبہ "جسارت" پر پابندی عائد کی، اس کا ڈیکلریشن منسوخ کیا گیا اور پریس ضبط کرلیا گیا۔ لیکن "اہلِ جسارت" میدان میں ڈٹے رہے۔ "جسارت" کی بندش کے دنوں میں سلیم احمد کی کالم نگاری بھی تعطّل کا شکار ہو جاتی تھی۔ اخبار کی بحالی کے بعد سلیم احمد پھر سے لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ یہ سلسلہ ۸ برس تک چلتا رہا۔

"جسارت" سے وابستگی کے ضمن میں سلیم احمد کو ایک دوسرے قسم کے کرب سے بھی گزرنا پڑا۔ اُن کے اُستاد محمد حسن عسکری نظریاتی اعتبار سے "جسارت" اور "جماعتِ اسلامی" سے متفق نہیں تھے چنانچہ وہ سلیم احمد کی "جسارت" یا جماعت اسلامی کے کسی بھی اخبار یا رسالے سے وابستگی سے خوش نہیں تھے۔ تاہم سلیم احمد ایک عجیب دُھن میں "جسارت" اور اسی طرح کے دیگر اخبارات و جرائد میں لکھتے چلے گئے۔

اس اخبار میں اُن کا کالم "روبرو" کے عنوان سے چھپتا تھا۔ یہ ہفتہ وار کالم تھا لیکن بعض اوقات ہفتے میں ایک سے زائد بار بھی چھپتا رہا۔ ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد وہ اسلامی، قومی اور ملّی مسائل پر تواتر کے ساتھ لکھتے رہے۔

۱۹۸۱ء میں "جسارت" ہی میں اُن کا ایک متنازعہ فیہ انٹرویو چھپا اور چند کالم بھی قابلِ اعتراض سمجھے گئے۔ "جسارت" کی انتظامیہ سے اختلاف پیدا ہو گیا اور سلیم احمد نے "جسارت" سے علٰحدگی اختیار کرلی۔ سلیم احمد نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا۔ "اگر اخبار کی پالیسی اور سچّائی میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو میں ہمیشہ سچّائی کا انتخاب کروں گا۔"!

اخبار مذکور سے طویل وابستگی کے بعد اس سے علٰحدگی، سلیم احمد کے لئے ایک بڑا دُکھ بھرا فیصلہ تھا۔ اُنہوں نے علٰحدگی کے باوجود اہلِ جسارت پر واضح کر دیا کہ انہیں جب بھی اُن کے قلم کی ضرورت پڑی تو وہ حاضر رہیں گے۔ سلیم احمد کی یہ پیشکش اُن کی عظمتِ کردار کی دلیل ہے اور یہ

بھی کہ وہ جس بات کو سچ سمجھتے ہیں اُس پر کسی سمجھوتے کے قائل نہیں۔ اُن کا منشور تو یہ تھا۔
مجھے کچھ ایسی آنکھیں چاہییں اپنے رفیقوں میں جنہیں بے باک سچے آئینوں سے ڈر نہیں لگتا۔

موضوعات

اکثر ادیب و شاعر کالم نویسی کو ایک غیر علمی مشغلہ تصور کرتے ہیں۔ انہیں "اخبار کی ایک دن کی زندگی" کھٹکتی ہے۔ مگر یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ برِصغیر کی ممتاز ترین دینی، علمی اور ادبی شخصیات اخبارات و جرائد سے وابستہ رہی ہیں۔ انہوں نے ان ذرائع ابلاغ سے رائے عامہ کی تعمیر و تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

سلیم احمد نے جس انداز کی کالم نگاری کی وہ موضوعات کی دائمی اہمیت کے پیشِ نظر ایک مستقل مقام رکھتی ہے۔ اُن کے یہ موضوعات اخبارات کے صفحات پر چھپنے کی وجہ سے محض ایک دن کی زندگی نہیں رکھتے۔ اسی طرح معاشی مجبوری کے حوالے سے بھی سلیم احمد اُن معدودے چند نامور کالم نویسوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ جنہوں نے کالم نویسی کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔

حُریت کے آخری دنوں کو چھوڑ کر انہیں اپنے کالموں کا معاوضہ برائے نام ہی ملتا رہا۔ ایک ایسے زمانے میں جب شہرت، کسب زر اور اثر و رسوخ میں اضافے کی خاطر اخبار میں لکھنے کا چلن عام ہو، سلیم احمد نے ان تمام ترغیبات و تحریصات سے بے نیاز ہو کر اخبار نویسی کی۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنے چھوٹے آدمی نہیں تھے۔ ایک زمانہ انہیں جانتا تھا لیکن سب لوگ گواہی دیتے ہیں کہ اُن کی زندگی حرص و آز سے ہمیشہ بلند تر رہی۔

جب کبھی انہوں نے معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے لکھا تو بانگ دُہل اس کا اقرار کیا اور اپنی ایسی تحریروں کو "سیٹھ کا مال" قرار دیا۔ اتنی اخلاقی جراءت بھی ہمارے کتنے ادیبوں میں پائی جاتی ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ جو مال وہ "آرڈر پر" تیار کرتے تھے اور جسے وہ اون نہیں کرتے تھے، ہمارے ہاں کے کئی بڑے لکھنے والوں کے اصل مال سے بھی زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔

کئی لکھنے والے اجتماعی زندگی کے مرکزی دھارے سے کٹ کر ایک "گنبد بے در" میں قید ہو

جاتے ہیں۔ اپنی ذات کے خول میں سمٹنے کا یہ عمل ان میں سے اکثر کو نرگسی بنا دیتا ہے، ذاتی زندگی میں بھی اور اجتماعی زندگی میں بھی۔ سلیم احمد کی ذرائع ابلاغ خصوصاً اخبارات سے وابستگی اس امر کی غماز ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کے مسائل، معاشرے کے بنانے یا بگاڑنے کے عمل اور لوگوں کے دُکھ سُکھ کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ خیالات کی ان گنت سطحیں اور زاویے ایسے تھے جن کا اظہار کسی دوسری صنفِ ادب کی بجائے انہوں نے کالم میں بہتر طور پر کیا ہے۔

سلیم احمد نے اپنے کالموں کے موضوعات کے حوالے سے ایک انٹرویو میں کہا۔ "میں تو اسے ادیبوں کی مجہولیت سمجھتا ہوں کہ وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم شاعر ہیں، ہم فلاں ہیں (میرے کچھ دوستوں نے پوچھا) آپ ایک تخلیقی فن کار ہیں یا مؤرخ ہیں؟ میں نے کہا کہ بھائی یہ تو تاریخ ہے اگر مجھے سُتلی بنانے کے بارے میں لکھنا پڑا تو وہ بھی لکھوں گا۔" ۲

سلیم احمد کی کالم نگاری کا سب سے بڑا موضوع "زندگی" ہے۔ وہ زندگی کے ٹھوس تجربات کو کس قدر اہمیت دیتے تھے، اس کا اندازہ اُن کے ایک کالم سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ سلیم احمد کہتے ہیں۔ "بہت سے لوگ تجربہ کی کمی الفاظ سے پوری کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ ادب، زندگی اور لفظ کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے۔ لفظ جب تک زندگی سے نہیں ملتا، مردہ رہتا ہے۔ زندگی کے لمس سے لفظ وہ حرارت اور روشنی پیدا کرتا ہے۔ جس کے بغیر کوئی تخلیق تخلیق نہیں بن سکتی لیکن ہم زندگی سے بے خبر لفظ سے لفظ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم مغرب کے ادیبوں کو پڑھتے ہیں اور ان سے باسی تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں تجربے کا نفسِ گرم نہیں ہوتا۔" ۳

ہماری موجودہ صحافت ایک نئی طرز کی یکسانیت کا شکار ہے یعنی ہنگامی واقعات کی اور ان کے حوالے سے ہنگامی مضامین اور کالموں کی یکسانیت۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اخباری صفحات محض وقتی، ہنگامی اور سیاسی مسائل کے لئے جیسے وقف ہو کر رہ گئے ہیں۔ اداریے ہوں یا مضامین، فیچرز ہوں یا ضمنی خبریں سب کے سب اسی ہنگامے کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں۔ سلیم احمد نے

موضوعات میں تنوع پیدا کیا اور کالم نگاری میں ایک نئی طرح ڈالی۔

سلیم احمد کے کالموں کے موضوعات کے جائزے سے جو فہرست بنتی ہے، ان میں درج ذیل موضوعات قابلِ ذکر ہیں ۔ ۱۔اسلامی نظام،۲۔ادب،۳۔کلچر اور زبان کے مسائل، ۴۔جمہوریت، ۵۔تعلیمی نظام کا مسئلہ، ۶۔عریانی اور فحاشی کا مسئلہ، ۷۔انقلابِ ایران، ۸۔روز مرّہ کے سماجی مسائل، ۹۔بعض حکومتی فیصلوں کے ردِّ عمل میں کالم، ۱۰۔کتابوں پر تبصرہ۔

اسلوب

اگر چہ ادب اور صحافت کی بحث کافی پرانی ہو چکی ہے لیکن سلیم احمد کی کالم نگاری کے اسلوب پر گفتگو کرتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کی وضاحت ازسرِ نو کر دی جائے۔

ٹی ایس ایلیٹ کے خیال میں ذہن کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو اپنی بہترین تحریر پیش کرنے کی طرف کسی فوری واقعہ یا دباؤ کے زیرِ اثر ہی مائل ہو سکتی ہے۔ ذہن کی اس قسم کو ایلیٹ صحافی کا ذہن قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سلیم احمد کی کالم نگاری ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کیونکہ انہوں نے اپنے ذہن کو کبھی صدورِ واقعات سے مغلوب نہیں ہونے دیا یا کم سے کم مغلوب ہونے دیا۔ انہوں نے واقعات و مسائل پر صحافی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ادیب کی حیثیت سے لکھا۔

سلیم احمد کے کالموں کی تہہ میں موجود شدّتِ احساس کالم نگاری کی ان مسائل سے کمٹمنٹ کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک کالم نویس کی حیثیت سے ان موضوعات کو برتنے میں سلیم احمد کی کامیابی اور انفرادیت کا راز اس میں ہے کہ برس ہا برس تک کالم نویسی کرنے کے باوجود انہوں نے اپنی ادیب کی حیثیت یا شناخت گم نہیں ہونے دی۔ وہ صحافت کے میدان میں رہ کر بھی ادیب ہی رہے، صحافی نہیں بنے ورنہ " بگڑا ادیب، صحافی" کی تہمت سے نہ بچ سکتے۔ شاہنواز فاروقی کے الفاظ میں ۔ "اس طرح اُن (سلیم احمد) کا معاملہ ایسے ادیبوں سے مختلف رہا جنہیں قصرِ صحافت میں داخلے کی اجازت اُس وقت ملی جب انہوں نے ادب کی دستارِ فضیلت اُتار کر ایک طرف رکھ دی۔" [۴۴]

سوال یہ ہے کہ جب وہ صحافت میں رہ کر بھی ادب کے آدمی رہے تو اس شعبے میں جانا کیا ضروری تھا؟ وہ یہ کام ادبی رسائل میں مضامین لکھ کر بھی انجام دے سکتے تھے۔ اس سوال کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ ادبی رسائل اب اپنے قارئین سے محروم ہوتے جا رہے ہیں، نیز ان رسائل کے چھپتے چھپتے اور قارئین کا ردِ عمل سامنے آتے آتے خاصا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کو موجودہ زمانے میں اخبارات کے ذریعے زیادہ احسن طریقے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سلیم احمد نے اپنے خیالات اور پیغام کی بہتر ترسیل کے لئے کالم نگاری اختیار کی یعنی

کیا تھا عشق کو پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

وہ مقبول قسم کے عوامی ادیب یا کالم نگار بننے کے چکّر میں نہیں پڑے انہوں نے وہی لکھا جو وہ لکھنا چاہتے تھے۔ بلاشبہ قاری اُن کے نزدیک اہم تھا لیکن خیال سے زیادہ اہم نہیں تھا۔ وہ ایسے کالم نگار نہیں تھے جن سے قارئین سامانِ دلبستگی کی توقع رکھتے ہیں۔ قارئین کو خوش کرنا، انہیں گلابی خیالات کی غذا بہم پہنچانا، پر لطف فقروں اور لفظی الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنا، غرضیکہ اس قسم کی فکاہیہ کالم نگاری سے اُن کا دُور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ بلکہ وہ اس قسم کی فکاہیہ کلام نویسی کو پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ سلیم احمد کے خیال میں فکاہیہ کالم نویسی کے بڑھتے ہوئے رجحان نے قارئین کو اس بات کا عادی بنا دیا ہے کہ وہ سنجیدہ مسائل کو بھی طنز و مزاح کے پیرائے میں قبول کریں۔

سلیم احمد کالم کو لائق مطالعہ ضرور بناتے تھے لیکن اس کی خاطر تحریر کو بے مغز بنا دینا انہیں پسند نہ تھا۔ اگر کالموں کو محض دلچسپ بنانا مقصود ہوتا تو یہ اُن کے لئے انتہائی آسان کام تھا۔ انہیں کاٹ دار نثر لکھنے پر قدرت حاصل تھی بلکہ وہ تو اپنے تند و تیز اور نوکیلے فقروں ہی کی وجہ سے طناز ادیب مشہور تھے۔ اگر چہ اس ہنر کا اظہار کہیں کہیں اُن کے سنجیدہ کالموں میں بھی ہوا ہے لیکن بس اس قدر کہ منہ کا ذائقہ بدل جائے یا پھر بیان میں زور پیدا ہو جائے۔ طنز کو وہ ہتھیار کے طور پر ضرور استعمال کرتے ہیں لیکن فکاہیہ کالم نویسوں کی طرح اس پر مکمل انحصار نہیں کرتے۔

فی زمانہ کالم نویسی میں دشنام طرازی کا چلن عام ہو چلا ہے، ایک روزنامہ میں تو ایک کالم کا عنوان ہی "کالم کلوچ" رکھا گیا ہے۔ سلیم احمد نے اپنے کالموں کو ایسی خرافات سے پاک رکھا۔ انہوں نے تو اس ذریعہ ابلاغ کو اس لئے اختیار کیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ بامعنی گفتگو میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ وہ معاشرے میں مکالمے کی روایت کو زندہ کرنے کے خواہاں تھے۔ مگر گفتگو کے معنی صرف بولنے کے نہیں ہوتے۔ گفتگو ایک شور کا نام نہیں۔ بہت سا بولنا بھی محض ایک شور ہوتا ہے۔ گفتگو تو اس شور میں ایک بامعنی اور دیرپا آواز کے اضافے کا نام ہے۔ سلیم احمد اسی گفتگو کے متمنی تھے۔

اسلامی نظام، مسائل اور تجزیئے

یہ سلیم احمد کے اُن کالموں کا انتخاب ہے جو انہوں نے روزنامہ "جسارت" کراچی میں ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء کے دوران میں لکھے۔ یہ سارے کلام ایک ہی سرچشمے سے پھوٹے ہیں یعنی دورِ حاضر میں اسلامی نظام کے نفاذ کا مسئلہ۔ کتاب میں شامل مضامین کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے سے ان کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ دین اور نظام
۲۔ اسلامی نظام اور اُس کا نفاذ
۳۔ طبقاتی معاشرہ اور اسلامی نظام
۴۔ پاکستان اسلامی ریاست کیسے بنے؟
۵۔ اسلامی نظام کون نافذ کر سکتا ہے؟
۶۔ ایک جذباتی تقریر کا تجزیہ
۷۔ مولانا مودودی کا ایک انٹرویو
۸۔ اسلام کا نظامِ تعزیرات اور اس کے مختلف پہلو
۹۔ جُرم وسزا کا مسئلہ
۱۰۔ زبانی جمع خرچ یا عملی اقدامات
۱۱۔ اسلام اور سوشلزم
۱۲۔ اصلاحِ معاشرہ
۱۳۔ تخریبی رجحانات اور معاشرہ
۱۴۔ ہمارے تضادات
۱۵۔ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ
۱۶۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت
۱۷۔ اسلام اور دنیاوی کامیابی
۱۸۔ کچھ سامنے کے مسائل

۱۹۔ اصولِ اتحاد
۲۰۔ ہم اور ہمارے ذرائع ابلاغ
۲۱۔ پاکستان میں کردار کا بحران
۲۲۔ قوم اور دانش ور
۲۳۔ قومی تشخص کا مسئلہ
۲۴۔ کچھ اخلاق کے بارے میں
۲۵۔ مغربی تہذیب کا مسئلہ
۲۶۔ ذہنی غلامی سے نجات کا مسئلہ
۲۷۔ کچھ نظامِ تعلیم کے بارے میں
۲۸۔ ادب اور ثقافت
۲۹۔ نظریاتی مملکت میں ادیب کا کردار

حرفِ آخر

سلیم احمد کی کالم نویسی کے اس جائزے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلیم احمد ایک منفرد اور ممتاز کالم نویس تھے۔ زندگی کے عشق، وسیع ذہنی کینوس اور گہرے مطالعے نے ان کے کالموں میں ایک ایسی خُوبی پیدا کر دی ہے جسے ہم سلیم احمد ہی کی طرزِ خاص کہہ سکتے ہیں۔

۱۔ سلیم احمد کے کالموں کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ اس قدر تنوع اُردو کے کسی اور کالم نویس کے ہاں خال خال نظر آتا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں گزشتہ صفحات میں دی جا چکی ہیں۔

۲۔ سلیم احمد کے موضوعات میں تنوع ہی نہیں تواتر بھی ہے یعنی وہ ایک ہی موضوع کو مسلسل زیرِ بحث لاتے ہیں۔ یہ ایک صحافتی طرز یا مجبوری بھی ہوتی ہے۔
اس طرح انہوں نے مختلف موضوعات پر مختلف اوقات میں جو بحث کی ہے اس میں ایک فکری ربط و تسلسل پایا جاتا ہے۔

۳۔ اُن کے موضوعات وقتی یا ہنگامی نہیں بلکہ مستقل ہیں۔

۴۔ اُن کی کالم نویسی کی ایک منفرد جہت اُن کی دانشورانہ اپروچ ہے۔ جس میں وسعت آمیز گہرائی پائی جاتی ہے۔

۵۔ سلیم احمد کی فکر اپنے جوہر میں تہذیبی و ثقافتی ہے، سیاسی نہیں۔

۶۔ اُن کی فکر پر فنکارانہ طرزِ احساس کا غلبہ ہے۔ یہ فنکارانہ احساس انہیں ہمیشہ مسلّمات کو رد کر کے نئے امکانات کی تلاش پر اُکساتا ہے۔

۷۔ اِن امکانات کی تلاش میں وہ اکثر سوال در سوال کا طریقۂ کار اختیار کرتے ہیں

۸۔ سوال در سوال کا یہ عمل ان کی فکر میں ایک طرح سے تشکیکی روّیے کو جنم دیتا ہے۔

۹۔ سلیم احمد کی فکر میں حقیقت پسندی کا عنصر نمایاں ہے چنانچہ وہ اکثر اوقات کسی ذہنی تحفظ کے بغیر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔

۱۰۔ ان کے یہاں اکثر اوقات احساس کو دلیل پر فوقیت ملتی ہے۔

۱۱۔ سلیم احمد "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کا انداز نہیں اپناتے۔

۱۲۔ اُن کا اسلوب مکالماتی اور ادبی چاشنی سے لبریز ہے جس کے باعث اِن کے کالموں کی READABILITY بڑھ گئی ہے۔ تاہم محدود اشاعت کے اخبارات میں شائع ہونے کی وجہ سے ان کالموں کا افادہ اور پھیلاؤ یا RANGE اُن کے شایانِ شان نہیں ہو سکا۔

اس مطالعے سے سلیم احمد کی کالم نویسی کے جو خدّ و خال ابھرتے ہیں وہ کسی بھی شخص کے لئے حیرت انگیز بھی ہیں اور یادگار بھی۔ سلیم احمد اپنی اس طرزِ خاص کے مُوجد بھی ہیں اور شاید خاتم بھی۔

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل
عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

سلیم احمد بحیثیت ڈراما نویس

اُردو ڈراما ۔ پس منظر

فن ڈراما کا آغاز یونان سے ہوا۔ یونان کی طرح آریائی ہندوستان میں بھی مذہبی اہمیت اور دربار پرستی کی بناء پر اس فن نے بے حد ترقی کی۔

مسلمانوں نے اپنے مخصوص مذہبی عقائد کی بناء پر ڈراما اور راگ رنگ سے کوئی دلچسپی نہ لی تعیش اور بادہ نوشی کے باوجود بھی کسی مسلمان بادشاہ نے ذاتی طور پر ڈراما کی سرپرستی کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جس کا نتیجہ اس صنف کے زوال، انحطاط اور پھر بالآخر خاتمہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تاہم برس ہا برس تک برصغیر میں ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مسلمانوں میں جہاں کئی ہندوانہ رسوم و رواج درآئے وہاں فنِ ڈراما کی مختلف شکلوں سے بھی اُن کی دلچسپی بڑھ گئی۔ تاہم "یہ امرِ واقعہ ہے کہ ڈراما مسلمانوں کی فنی روایت کا کبھی حصہ نہیں بن سکا۔"[1]

اس سلسلے میں محمد حسن عسکری کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فنون سے قطع تعلق کرنے کی بجائے اُنہیں اپنا کر اپنی پہچان پیدا کرنی چاہیے جیسا کہ مسلمان موسیقاروں نے موسیقی سے قوالی کا کام لے کر کیا ہے۔ یہ مسلمانوں کی موسیقی کہی جا سکتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو دیگر فنون خصوصاً ڈراما سے گھبرانے کی بجائے اس اہم ذریعہ ابلاغ و تفریح کو اپنی خاص پہچان عطاء کرنی چاہیے۔ یہی روّیہ فنِ مصوری یا فنِ رقص میں روا رکھنا چاہیے۔

سلیم احمد نے ایک بیدار مغز دانشور کی طرح فنِ ڈراما کو اپنے اظہار و ابلاغ کا ایک مؤثر ترجمان بنایا۔ انہوں نے سٹیج، ریڈیو، فلم اور ٹیلی وژن کے لئے متعدد ڈرامے لکھے۔

سٹیج ڈرامے

شاعری کی طرح سٹیج ڈرامے اور فلموں وغیرہ سے دلچسپی بھی سلیم احمد کو سکول کے زمانے ہی سے پیدا ہوگئی تھی۔ کراچی میں رہتے ہوئے سلیم احمد کو اپنے سامنے سٹیج ڈرامے کی عمومی صورت حال اور کراچی میں بالخصوص اسٹیج کی کس مپرسی نظر آتی تھی لیکن اُنہوں نے ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ اسٹیج کی دنیا میں قدم رکھا۔ ایک روایت کے مطابق سلیم احمد نے اسٹیج کے لئے تقریباً ایک سو ڈرامے لکھے۔

اُن دنوں کراچی میں خواجہ معین الدین کا نام اسٹیج ڈراموں کے حوالے سے ایک معروف اور مستند نام تھا۔ اُن کا ڈراما "غالب بندر روڈ پر" اسٹیج اور ریڈیو کا بے حد مقبول ڈراما سمجھا جاتا ہے۔ سلیم احمد کو خواجہ صاحب کے ساتھ کام کرنے کا کافی موقعہ ملا۔ اسٹیج کے لئے سلیم احمد نے "۱۹۴۷ء" کے عنوان سے پہلا ڈراما لکھا۔ انہوں نے یہ ڈراما خواجہ معین الدین کے مشورہ پر لکھا۔ "۱۹۴۷ء" میں جہاں ہندو بنیے کی گھٹیا سیاست کا پردہ چاک کیا وہاں اپنوں کی سازشوں کو بھی ہدفِ تنقید بنایا۔ تحریک پاکستان کے سچّے اور مخلص کارکنان کا رول بھی اُجاگر کیا اور بابائے قوم کی ولولہ انگیز قیادت کو بھی اس میں منعکس کیا۔

سلیم احمد کے دوسرے اسٹیج ڈرامے کا عنوان "لال نشان" تھا جو تحریکِ آزادی کشمیر کے تناظر میں لکھا گیا۔ "لال نشان" کی کہانی بھی نہایت جاندار اور ولولہ انگیز تھی اور اس کی پروڈکشن بھی۔ اس ڈرامے کی ڈائریکشن بھی خواجہ معین الدین ہی کی تھی۔

ان جذباتی اور قومی المیّوں سے جنم لینے والے دو موضوعات پر کامیاب ڈرامے لکھنے کے بعد سلیم احمد نے کچھ طنزیہ ومزاحیہ اور جاسوسی نوعیت کے ڈرامے بھی لکھے۔ ان میں "خالہ جان" بہت چلا۔ اسے بھی خواجہ معین الدین نے اسٹیج پر پیش کیا۔ یہ طبع زاد ڈراما نہ تھا بلکہ اس کی کہانی "VERGINA'S HUSBAND" سے ماخوذ تھی۔ اسی طرح "دیکھا جائے گا"، "ایک اور ایک گیارہ" اور "روحوں کا چکر" بھی اسٹیج پر پیش کئے گئے۔

ریڈیو ڈرامے

ایک روایت کے مطابق سلیم احمد نے ریڈیو کے لئے تقریباً تین سو ڈرامے لکھے۔ اُن کے کُچھ معلوم ڈرموں کی تفصیل درج ذیل ہے۔ ان ڈراموں کی ریکارڈنگ سنٹرل پروڈکشن یونٹ پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن میں محفوظ ہے:۔

۱۔ آخرِ شب کا ہم سفر　۲۔ آخری ٹرین　۳۔ آئینے

۴۔ البرامکہ　۵۔ الٹ پھیر　۶۔ ایسا کچھ کر چلو

۷۔ جب سورج ڈھلنے لگا　۸۔ خالہ جان　۹۔ روحوں کا چکّر

۱۰۔ روشنی کے مسافر　۱۱۔ سوال　۱۲۔ نئی فصل　۱۳۔ دیوار

کچھ تفصیلات ریڈیو کے پندرہ روزہ میگزین "آہنگ" سے بھی دستیاب ہوئی ہیں ۔ نیز ڈاکٹر مشرف احمد نے بھی انہیں "سلیم احمد۔ کتابیات" میں درج کیا ہے:۔

۱۴۔ فرعون کی بیٹی　۱۵۔ مکان نمبر ۱۳ (ماخوذ) ۱۶۔ لالوکھیت کی ایک رات

۱۷۔ شاہراہِ حیات　۱۸۔ ایڈمنڈ برک (ماخوذ)　۱۹۔ خودکشی

۲۰۔ ہیبت محل (ماخوذ) ۲۱۔ نغمانہ　۲۲۔ تیمور

۲۳۔ وہ۔ جو مر چکا تھا۔ ۲۴۔ ناگن　۲۵۔ ایک گھر

۲۶۔ جھوٹا دیوتا　۲۷۔ چنگیز خاں　۲۸۔ آہٹیں

۲۹۔ مینا　۳۰۔ بابا گوریو　۳۱۔ سلطان شہید

۳۲۔ خودکشی　۳۳۔ قبرستان　۳۴۔ کفّارہ

۳۵۔ سقراط　۳۶۔ موسم اور محبت　۳۷۔ الٹ پھیر

۳۸۔ دیکھا جائے گا۔ ۳۹۔ صیاد　۴۰۔ گُل ہی نہ جانے

۴۱۔ التونیہ　۴۲۔ نئی کرن　۴۳۔ الف لیلیٰ کی رات

۴۴۔ ایک اور ایک گیارہ　۴۸۔ فتح اُندلس

سلیم احمد کے کُچھ ڈراموں کے ترجمے بھی ہوئے۔ مثلاً دیوار کا ترجمہ گجراتی زبان میں اور ناگن

،سلطان شہید، چنگیز خاں اور جھوٹا دیوتا کا ترجمہ سندھی زبان میں ہوا۔

جنگ آزادی ۱۹۵۷ء کے سلسلے میں سلیم احمد نے چند ایک خصوصی ڈرامے بھی لکھے۔

۱۔ زنجیریں ۲۔ ۱۸۵۷ء ۳۔ چراغِ سحری ۴۔ کاروان بہار

اُن کے درج ذیل ریڈیو فیچر اور یک مزاحیہ ڈرامے کا سُراغ بھی ملتا ہے۔

۱۔ اپنا وطن ۲۔ جہادِ زندگانی ۳۔ روز و شب

۴۔ ننگا پربت کی مہم ۵۔ تحلیلِ نفسی۔ مزاحیہ ڈراما

مذکورہ بالا ڈراموں کے علاوہ سلیم احمد نے ٹیلی وژن کے لئے درج ذیل موضوعات پر مرکزی موضوع "روشنی" کے حوالے سے ریڈیائی تحریر میں بھی پیش کیں۔

"۱۔ عبادات و معاملات ۲۔ توازن و اعتدال ۳۔ مکافاتِ عمل

۴۔ فکر و عمل کی صحت ۵۔ سچا دینی راستہ ۶۔ امانت داری

۷۔ جدال و قتال سے گریز ۸۔ حضرت مجدّد الف ثانیؒ

"۱۔ خدا پرستی اور خودنگہداری ۲۔ اتحاد ۳۔ فکر و عمل

۴۔ توازن اور ہم آہنگی ۵۔ نفاذِ قانون اور عدل ۶۔ بڑا آدمی

۷۔ سچ ۸۔ اتفاق ۹۔ غصّے کو ضبط کرنا

۱۰۔ حسن سلوک ۱۱۔ تہذیب کی بنیاد ۱۲۔ انسان اور کائنات

۱۳۔ اچھی اور بری باتیں ۱۴۔ غصّہ بری چیز ہے۔ ۱۵۔ معاشرے میں اچھائیاں

۱۶۔ بُرائیاں ۱۷۔ انسانِ کامل ۱۸۔ تقدیر پر توکل

۱۹۔ تاریخ کا سبق ۲۰۔ مکافاتِ عمل ۲۱۔ زبان

۲۲۔ صبر و شکر ۲۳۔ حصولِ معاش ۲۴۔ تفکّر

۲۵۔ تزکیہ نفس ۲۶۔ خیال اور عمل ۲۷۔ جنت کی طلب

۲۸۔ ضمیر کیا ہے؟ ۲۹۔ عزتِ نفس ۳۰۔ انسانی اعمال کی قسمیں

۳۱۔ خوف اور لالچ

انہوں نے اپنے ایک انٹرویو۲ میں درج ذیل ڈراموں کو اپنے بہترین ریڈیائی ڈرامے قرار دیا ہے۔

ا۔ تاریخی حوالے سے

۱۸۵۷ء، تیمور، چنگیز خاں

ب۔ سماجی حوالے سے

موسم اور محبت، گُل ہی نہ جانے، نیند کی وادی، شاہراہِ حیات، خُودکشی، یہ کس کی لاش ہے؟

ج۔ جاسوسی حوالے سے

ہیبت محل، وہ۔ جو مر چکا تھا، ناگن، صیّاد

سلیم احمد نے اپنے شاہکار ڈرامے "جُوئے شیر" میں ماضی اور حال کی آمیزش سے طنزیہ اور مزاحیہ اُسلوب کے ساتھ ہمارے سماجی بحران کو پیش کیا ہے۔ یہ ڈراما ایک لحاظ سے مشہور تاریخی کہانی، خسرو، کوہکن وشیریں کی پیروڈی ہے اور سلیم احمد کے گہرے مطالعے، تاریخی شعور اور سماجی حقائق سے آگہی کا آئینہ دار بھی۔

سماجی موضوعات میں سے "موسم اور محبت" سلیم احمد کا ایک شاہکار ریڈیائی ڈراما ہے۔ انہوں نے چار پانچ کرداروں کی مدد سے عورت اور مرد کے درمیان محبت اور تخلیق کے ازلی و ابدی رشتوں کی کشمکش کو نہایت فنکارانہ انداز سے بیان کیا ہے۔

سلیم احمد نے اس ڈرامے میں "ایڈی پس" الجھن سے بڑھ کر کچھ پیش کیا ہے۔ انہوں نے آدم و حوّا کے لمحہ تخلیق اور اس کے اسرار و رموز کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اختتامیہ مکالمات میں سارے موضوع کا نچوڑ سمٹ آیا ہے۔

"شہناز: اختر اور انور میرے لئے مر چکے۔ یا شاید اس کے برعکس میں ان کے لئے مر چکی اور صرف آپ کی بیٹی کے روپ میں زندہ ہوں"۔

ڈاکٹر! ہاں بیٹی۔ تُو نے بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ تُو بہت تھک گئی ہے۔ تُجھے نیند آرہی ہے۔ میرا سینہ تیرا پہلا اور آخری گہوارہ ہے۔ اپنے گہوارے میں سو جا بیٹی جس طرح ازل میں سو رہی تھی۔ (افسردہ ہنسی)

خُداوندا! میں لوٹ آیا ہوں۔ تُو نے مجھے جنت میں جگہ دی۔ میں تنہا اور اُداس تھا۔ تُو نے میری پسلی سے حوّا کو پیدا کیا۔ حوّا کائنات کی پہلی بیٹی۔ پہلی بیوی اور پھر پہلی ماں۔ ماں کی تقدیر ہی ہے خداوندا کہ وہ نیا گھر بسائے۔ حوّا نے جنت کو چھوڑ کر گھر اپنا بنایا۔ یہی سارا گناہ تھا۔ لیکن اب ہم دونوں لوٹ آئے ہیں۔ ندامت کے بغیر، تحیّر کے بغیر، غم کے بغیر، موت کے بغیر۔ گناہ کا کفارہ ادا ہو چکا۔ خداوندا! کیا تیری جنت کے دروازے ہم پر نہیں کھولے جائیں گے؟"۔

سلیم احمد کے جاسوسی ڈرامے زیادہ تر ماخوذ کہانیوں پر مبنی ہیں۔ ان میں سلیم احمد کا گہرا مطالعہ اور اخذ و ترجمہ کی صلاحیت جھلکتی ہے۔ اُنہوں نے سادہ ترجمہ سے "چلاؤ کام" نہیں کیا بلکہ اسے ایک تخلیقی آہنگ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان ڈراموں میں دلچسپی اور سبق آموزی کے لئے سبھی تکنیکی لوازم کا خیال رکھا گیا۔

اب رہی بات سلیم احمد کے ریڈیائی ڈراموں کے فنّی معیار کی یا فنِ ڈراما کے حوالے سے اِن ڈراموں کے مقام و مرتبے کی۔ بلاشبہ یہ ڈرامے اپنے وقت کے مقبول ڈرامے تھے۔ ان کے معیاری ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اس کا صحیح اندازہ لگانا شاید ممکن نہیں یوں تو بیسویں صدی خصوصاً اس صدی کا نصف آخر مختلف ایجادات اور دریافتوں کے حوالے سے انتہائی تیز رفتار واقع ہوا ہے لیکن آخری عشرہ میں تو طوفانی تبدیلیاں واقع ہوئی۔

۴۰ء، ۵۰ء اور ۶۰ء کی دہائیوں میں ریڈیو خاص و عام کی محبوب تفریح بھی تھا اور ذریعہ تعلیم و معلومات بھی۔ ریڈیو کی مقبولیت نے سٹیج کو متاثر کیا جبکہ فلموں کی آمد نے سٹیج اور ریڈیو دونوں پر اثر ڈالا۔ پھر ٹیلی وژن کے آتے ہی سٹیج، ریڈیو اور فلم سکڑ کر رہ گئے۔ وڈیو کیسٹ کے جن نے اِن تینوں کو ہڑپ کرنے کی کوشش کی۔ جہاں بڑے بڑے سینما گھر تھے وہاں مارکیٹیں اور شاپنگ پلازہ بن رہے ہیں ریڈیو والے خود بھی کسی میچ کی کمنٹری سُنتے "نہیں" دیکھتے "ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں کھلنے والے "منی سینما گھروں" نے ٹیلی وژن کے پروگراموں کی بے رنگی یا بدرنگی کی جگہ "رنگین" پروگرام متعارف کرائے ہیں۔ تازہ ترین سلسلے میں سی این این اور کئی مختلف سیٹلائیٹ چینلز اور انٹرنیٹ ہیں۔ آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا؟

جو باتیں پانچ دس سال پہلے فحش یا قابلِ اعتراض سمجھی جاتی تھیں، اب وہ نہ صرف گوارا ہیں بلکہ آہستہ آہستہ روزمرّہ کا حصہ بنتی جا رہی ہیں۔ جن شہروں میں عورتیں بازاروں میں نظر نہیں آتی تھیں اب وہاں کے بازاروں میں عورتوں کی ٹولیاں شاپنگ میں مصروف نظر آتی ہیں۔ جہاں کچھ عورتیں برقع میں ملبوس نظر آ جاتی تھیں اب وہاں برقع کا نام و نشان نہیں، سر پر چادر بھی نہیں حتیٰ کہ دوپٹہ تک نہیں۔ یہ سب کچھ الیکٹرانک میڈیا کی تیز رفتار ترقی کے نتائج ہیں۔ اس صورت حال میں نہ صرف سلیم احمد بلکہ ریڈیو کے کسی بھی پُرانے ڈراما نگار کی خدمات یا اُس کے فنی معیار کا اندازہ لگانا خاصا مشکل کام ہے۔

اس پس منظر میں سلیم احمد کی فنی کوششوں کا جائزہ لینا گویا ایک خاص دور میں ڈراما کی معنویت اور عوام و خاص کی پسند و ناپسند کا اندازہ لگانا بھی ہے۔ سلیم احمد نے عوامی ذوق اور پسند کا خیال رکھا اور ایسے ڈرامے لکھے جو نہ صرف مقبولیت کے لحاظ مستند تھے بلکہ ڈراما کے فنی معیار پر بھی پورے اُترتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن کے ڈراموں کی مقبولیت اور فنی معیار میں اضافہ ہوتا گیا اور ایک ایسا وقت بھی آیا جب اُن کے ڈرامے "سٹوڈیو نمبر ۹" میں بہترین ڈرامے سمجھے گئے۔ تاہم سلیم احمد اپنے ایسے تمام ڈراموں وغیرہ کو "سیٹھ کا مال" کہا کرتے تھے۔

وہ اپنے ریڈیو کے کام کو " کمرشل "یا دھر گھسیٹی" کہہ کر ڈس اون (DISOWN) کرتے تھے لیکن اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سلیم احمد کی انکساری اور شانِ بے نیازی ہے یا اُن کے سامنے کوئی بہت بڑا معیار ہوگا۔ وہ کہتے ہیں۔

"کہاں میں کہاں فنِ تمثیل سازی	یہ اپنی روایت ہے اک مرغ بازی
تو میں نے بھی دو چار مُرغے لڑائے	"الٹ پھیر" کے چند کرتب دکھائے
یہاں سے وہاں سے خیالات اُڑائے	پلاٹ اور کردار بھی کچھ چرائے
کچھ اپنی طرف سے پھر اس میں ملایا	ڈرامہ نویسی کا چکّر چلایا
ڈرامے شرامے کہ تقریر و فیچر	وہ سب جن سے ہے سستی شہرت کا چکر
لکھے میں نے اتنے کہ شہرت سمیٹی	وہ شہرت کہ ہے شہرت دھر گھسیٹی

مگر یہ بھی یاروں کو میرے گراں تھا　　　خفا تھا کوئی اور کوئی بدگماں تھا

کہ لہجے ادھر سے اُدھر ہو گئے ہیں　　　غزل گو پلے رائٹر ہو گئے ہیں

مگر خیر اچھی ہوا چل گئی ہے　　　ادب کے تو سر سے بلا ٹل گئی ہے۔''

بہت سے ڈراما نگار اپنی اُن تحریروں کو حاصلِ زیست سمجھتے ہیں جنہیں سلیم احمد اپنی کسرِ نفسی سے مسترد کر دیتے ہیں۔ اُن کے ڈرامے "جوئے شہر"۔ "گل ہی نہ جانے"۔ "موسم اور محبت"۔ "وہ۔ جو مر چکا تھا"۔ "جرم و سزا"۔ "شاعری، شوہری نوکری"۔ "خالہ جان"۔ "روحوں کا چکر"۔ "چنگیز خاں اور "شیوۂ اہلِ نظر" کو "دھر گھسیٹی" کہنا ناانصافی ہوگی۔

اِس "الزام دھر گھسیٹی" کو انہوں نے خود ہی اپنے سر لیا تھا لیکن کبھی کبھار وہ ترنگ میں آ کر اپنے اصل مقامِ ڈراما نگاری کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اُن کا نام تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند" میں بطور ڈراما نگار آیا ہے۔ انہوں نے اپنے متعدد انٹرویوز میں بھی اپنی ڈراما نگاری اور اس اعلیٰ معیار کا ذکر کیا ہے۔

ڈراموں کے علاوہ انہوں نے ریڈیو کے لئے دینی تعلیمات کا پروگرام "روشنی" نیز بچوں اور خواتین کے پروگرام بھی لکھے حتیٰ کہ کھیلوں وغیرہ کے پروگرام بھی تحریر کئے۔ مثلاً ایک بار ڈاکٹر اسلم فرخی کے ہمراہ بھولو برادران کی کشتیوں کے حوالے سے بھی ایک پروگرام پیش کیا۔ اسی طرح قومی نشریاتی پروگراموں میں بھی انہوں نے کئی پروگرام لکھے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے کہا۔ "بڑی محنت کی، بڑا خونِ جگر صرف کیا۔ ریڈیو کی دنیا میں سلیم احمد کی بڑی دھوم رہی اور انہیں بڑا اعزاز حاصل ہوا۔" [۳]

فلمی کہانیاں اور مکالمات

سلیم احمد کا فلمی زندگی میں داخلہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ اُن کا زیادہ تر تعلق پاکستانی فلموں کے پہلے دور یعنی ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک رہا۔ وہ کبھی بھی شاید فلمی زندگی میں نہ آتے لیکن ۱۹۵۵ء میں انہیں اپنے ایک عزیز دوست کے کہنے پر صوفی نذیر الہ آبادی کے ایک رسالے کی ادارت کی

ذمہ داری قبول کرنا پڑی۔ "سیارہ" ایک باتصویر، دیدہ زیب اور معیاری ماہانہ میگزین تھا۔ اس کے مالک صوفی نذیر کو فلمسازی کا بھی بہت شوق بلکہ جنون تھا۔ صوفی نذیر نے سلیم احمد کو اپنے ساتھ فلمی لائن میں کہانی نویس کی حیثیت سے کھینچ لیا۔

ایک روایت ہے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے ۱۹۴۶،۴۷ء میں جب سلیم احمد میرٹھ کالج میں انٹر کے طالب علم تھے تو انہوں نے ایک فلمی کہانی "چراغ جلتا ہے" کے عنوان سے لکھی۔ انہوں نے یہ فلمی کہانی اپنے ایک عزیز اور اعلیٰ سرکاری عہدیدار احسان الحق صاحب کے توسط سے اُس وقت کے مشہور ہدایت کار اور فلمساز ڈاکٹر دی شانتارام کو دکھائی۔ ڈاکٹر شانتارام نے اس کہانی کو بہت پسند کیا لیکن سلیم احمد کی کہانی میں کوئی گانا نہیں تھا۔ ڈاکٹر رام کم از کم پندرہ گانے رکھنے پر مُصر تھے۔ بالآخر سلیم احمد پانچ گانوں کی کھپت ADJUSTMENT پر رضامند ہو گئے۔ بعد ازاں نامعلوم وجوہ کی بناء پر سلیم احمد کی اس کہانی پر فلم نہ بن سکی۔ چنانچہ سلیم احمد کا یہ کہنا" کہانی تو کیا میں کہانی کی دُم سے بھی واقف نہیں ہوں" اِنکساری اور اُن کی شخصیت کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔

اُن کے ایک فلمی دوست عطا صدیقی صاحب کا کہنا ہے۔ "سلیم بھائی بہت بڑے کہانی نویس تھے۔ اگرچہ فلم لائن سے اُن کی طبعی رغبت نہیں تھی لیکن وہ محنت بہت کرتے تھے۔ وہ واقعی ایک تخلیقی فنکار اور کہانی نویس تھے۔"

صوفی نذیر الہ آبادی نے ایک فلم "راز" بھی بنائی۔ اس کی کہانی سلیم احمد نے لکھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پاکستان کی پہلی جاسوسی فلم تھی۔ یہ فلم توقع سے بڑھ کر کامیاب ہوئی۔ اس کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ "راز" کی کامیابی پر فلم کے دیگر عملے کے ساتھ سلیم احمد کو بہترین کہانی نویس کا "نگار ایوارڈ" دیا گیا۔ یہ فلم ۱۹۵۶ء میں ریلیز ہوئی۔ انہوں نے فلم "جھومر" کی کہانی بھی لکھی مگر یہ ریلیز ہی نہ ہو سکی۔

سلیم احمد نے ایک منفرد فلم "احسان" کی کہانی بھی لکھی۔ کہانی بڑی عمدہ تھی اور سلیم احمد کی تخلیقی اُپج کی غماز لیکن یہ بھی صوفی نذیر الہ آبادی کی تلوّن مزاجی کا شکار ہو کر نامکمل رہ گئی۔ سلیم احمد نے فلم "بیداری" کی کہانی بھی مکمل کی لیکن ڈائریکٹر فدا یزدانی اس فلم کا آغاز کر کے غائب ہو گئے۔ محمد حسن

منطقی نامی ایک بڑے "فنکار" نے بھی سلیم احمد سے "فنکار" نامی فلم کے لئے ایک کہانی لکھوائی لیکن رقم مار گئے اور فلم نہ بنا سکے۔ یہاں انہوں نے متعدد فلموں کے سکرپٹ پلے اور مکالمات وغیرہ بھی لکھے۔ اِن میں فلم "پھر چاند نکلے گا" کا سکرپٹ پلے اور مکالمات بھی یادگار تھے۔

سلیم احمد کی فلمی زندگی کا عرصہ کم و بیش پندرہ برسوں پر محیط ہے تقریباً ۱۹۵۱ء سے لے کر ۶۵/۱۹۶۴ء کے لگ بھگ۔ اس عرصے میں ابتدائی پانچ سال اور آخری پانچ سال کا تعلق تو قدرے ڈھیلا ڈھالا سا ہے لیکن ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیانی عرصے میں اُنہوں نے بہت پتّا ماری کی۔

سلیم احمد کا نام اگرچہ بہت بڑے فلمی کہانی نویس کی حیثیت سے مستند نہ ہو سکا کیونکہ اُن کی بہت کم فلمیں ریلیز ہو سکیں تاہم انہوں نے ان کچھ کامیاب اور کچھ ناکام تجربات سے بہت کچھ سیکھا۔ اُن کا کہنا تھا۔ "اگر کوئی پروڈیوسر مجھے لکھنے کی مکمل آزادی دے دے تو میں اِسے اس بات کی مکمل ضمانت دینے پر تیار ہوں کہ میری لکھی ہوئی کہانی ناکام نہیں ہوگی۔"

اس سلسلے میں معروف فلمی کہانی نویس اور صحافی علی سفیاؔن آفاقی کا کہنا ہے۔ "سلیم احمد کی یہ بات مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ کوئی بھی فلم صرف کہانی کے زور پر کامیاب نہیں ہوا کرتی۔ سلیم احمد کی بات دانشورانہ پہلو سے درست ہے لیکن فلمی زندگی کی عملی مجبوریاں اچھے اچھے فلمسازوں اور کہانی نویسوں کو بھٹکا دیتی ہیں اور وہ وہی کچھ لکھتے اور پروڈیوس کرتے ہیں جو عوام کی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔" [۴]

سلیم احمد نے "صنم کدہ پروڈکشنز" کے نام سے ایک فلمی ادارہ بھی قائم کیا تھا۔ جس کا دفتر ۱۰۴۔ جہانگیر روڈ۔ کراچی میں قائم تھا۔ وہ اپنے فلمی شعبے کے دوستوں کے ہمراہ یہاں بیٹھتے اور مختلف کہانیوں پر کام کرتے تھے۔

سلیم احمد کا مؤقف ہمیشہ یہ رہا کہ فلموں میں سرمایہ لگانے والے غیر معیاری فلمیں اس لئے بناتے ہیں کہ وہ اپنی نااہلی کو چھپا سکیں۔ ایسے فلمساز کہانی اور دیگر تکنیکی اُمور پر توجہ دینے کی بجائے فلم میں لچر پن شامل کر کے اسے عوام کے سر منڈھ دیتے ہیں۔

شاید انہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ جونہی پاکستان ٹیلی وژن کی نشریات کا آغاز (۱۹۶۴ء) ہوا تو فلم

کے اچھے کہانی نویس اور دیگر اہلِ فن اس نئے میڈیا کی طرف متوجہ ہوئے۔ فلمیں آہستہ آہستہ کم سے کمتر بننے لگیں۔ اس کے مقابلے پر ٹیلی وژن نے نت نئے تجربات، نئے ٹیلنٹ اور دیگر ضروری اُمور پر توجہ دے کر عوام کی توجہ حاصل کر لی۔ سلیم احمد نے بھی ٹیلی وژن کے لئے لکھنا شروع کیا۔ یُوں بھی کراچی کے فلم اسٹوڈیوز ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ بند ہو گئے۔ بعد ازاں نامور اداکار محمد علی اور دوسروں نے سلیم احمد کو لاہور آنے اور معقول معاوضے پر کہانیاں لکھنے کہ پیشکش بھی کی مگر سلیم احمد پھر ادھر نہ آئے۔

ٹیلی وژن ڈرامے اور دیگر پروگرام

ٹیلی وژن کے حوالے سے سلیم احمد کا ٹیلنٹ متنوع صورتوں میں سامنے آیا۔ بلاشبہ وہ ایک ورسائلVERSTYLE لکھنے والے تھے۔ اُن کا بنیادی میدان تو ڈراما ہی رہا لیکن انہوں نے خواتین اور بچّوں کے پروگرام بھی کئے۔ دینی تعلیمات کے اور ادبی پروگرام بھی لکھے اور پیش کئے۔ اس سلسلے میں انہیں زیادہ تیاری کی ضرورت نہ تھی۔ اُن کا تجرِ علمی اور ہر وقت لکھنے پر مائل قلم اور ہمہ وقت بولنے پر قادر زبان، اچھے سے اچھا پروگرام پیش کر سکتی تھی۔

کراچی ٹیلی وژن کے لئے لکھے اور پیش کئے گئے سلیم احمد کے ڈراموں اور دیگر پروگراموں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ ان میں ایسے ڈرامے بھی شامل ہیں جو طبع زاد نہیں ہیں بلکہ سلیم احمد نے صرف اُن کی ڈرامائی تشکیل کی ہے۔

۱۔عکس اور آئینے	۲۔مُجرم	۳۔اُلٹ پھیر (ایوانِ تمثیل)
۴۔خالہ جان	۵۔نمرود کی خُدائی (ایوان تمثیل)	۶۔شریف آدمی (ایوان تمثیل)
۷۔جُرم وسزا	۸۔ممند بھائی (ایوان تمثیل)	۹۔موسم اور محبت
۱۰۔اُداس نسلیں	۱۱۔پانچ سال پہلے	۱۲۔شیوۂ اہلِ نظر (شبِ تمثیل)
۱۳۔آزادی کے مجرم (مولانا فضل حق خیر آبادی)		۱۴۔غلط در غلط (آج کا انتخاب)
۱۵۔اُداس نسلیں	۱۶۔سلطان شہاب الدین غوری (تاریخ ہم اور آپ)	

۱۷۔ پسنجر ٹرین (راستے) ۱۸۔ پہلا قدم (ترک تیز گام زن) ۱۹۔ بُرا آدمی (تازہ نفس)
۲۰۔ ممد بھائی (منٹوراما) ۲۱۔ کاغذ کی فصیل (ایک کھیل ایک کہانی) ۲۲۔ جھمکے (منٹوراما)
۲۳۔ ستون۔ خصوصی کھیل ۲۴۔ چھوٹے لوگ (خصوصی کھیل) ۲۵۔ خالق (ایک کھیل ایک کہانی) ۲۶۔ سورج کا داغ (ڈراما فیسٹیول) ۲۷۔ دائرے ۲۸۔ تعبیر ۲۹۔ آخری چٹان
۳۰۔ شاہین

واضح رہے کہ مندرجہ بالا تمام ڈرامے قومی نشریاتی رابطے پر پیش کئے گئے۔ اِن ڈراموں کے علاوہ سلیم احمد نے مندرجہ ذیل دیگر پروگرام بھی ٹیلی وژن پر پیش کئے۔

۱۔ متاعِ اقبال (محرم الحرام کے حوالے سے خصوصی پروگرام)
۲۔ مسدّسِ حالؔی (۱۲ ربیع الاوّل کا خصوصی پروگرام)
۳۔ پیامِ اقبال (محرم الحرام کا خاص پیام)
۴۔ آج کے دن (۲۶ سکرپٹس) ۵۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ
۶۔ بچوں کی تعلیم و تربیت (خصوصی تعاون) ۷۔ مردِ مومن (اقبال پر خصوصی پروگرام)
۸۔ حرفِ حق (سلسلہ تقاریر) ۹۔ بصیرت (تفسیر و ترجمہ)
۱۰۔ بصیرت (دینی پروگرام) ۱۱۔ بصیرت (جمعۃ الوداع)
۱۲۔ بصیرت (دینی تقاریر) ۱۳۔ ذلک الکتاب (اسلامی تعلیمات)
۱۴۔ بصیرت (اسلامی تعلیمات) ۱۵۔ ماہنامہ (ادبی پروگرام)
۱۶۔ اسلامی تاریخ کا ایک ورق (رمضان المبارک کے حوالے سے خاص پروگرام)

سلیم احمد کو ایک لحاظ سے تاریخی موضوعات خصوصاً تاریخِ ہند اور تاریخِ اسلام کے حوالے سے ایک اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔ ۱۹۷۶ء میں بابائے قوم حضرت قائدِ اعظمؒ کے صد سالہ جشنِ ولادت کے حوالے سے جب قومی سطح پر یادگار پروگرام ترتیب دیئے گئے تو ٹیلی وژن نے بھی کئی ایک پائلٹ پروجیکٹ تیار کئے۔ انہی میں تحریکِ پاکستان کے پس منظر کو اُجاگر کرنے کے لئے ڈراموں کا ایک سلسلہ بھی تھا۔ سلیم احمد نے "دائرے" کے عنوان سے یہ سیریل لکھا۔ افتخار عارف

اس کے پروڈیوسر مقرر ہوئے مگر بعد ازاں اس ڈرامے کا عنوان بھی بدل دیا گیا اور پروڈیوسر بھی۔
اب اسے "تعبیر" کے نام سے ۱۹۷۶ء میں پیش کیا گیا۔ محسن علی نئے پروڈیوسر مقرر ہوئے۔
انہوں نے اعلیٰ مہارت اور تجربہ کار ٹیم کے ساتھ "تعبیر" کو پردہ سکرین پر پیش کیا۔

"تعبیر" میں حضرت قائدِ اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے سوا تاریخ و تحریکِ پاکستان کے تقریباً سبھی کردار ہمارے سامنے متحرک نظر آتے ہیں۔ بابائے قوم اور شاعرِ مشرق کے کردار شاید سوءِ ادب کے خیال سے کسی فنکار کو نہیں سونپے گئے یا کوئی ایسا قد آور فنکار ملا ہی نہیں جو ان اکابرین سے کچھ مشابہت رکھتا ہو۔

نئی نسل نے "تعبیر" کو نہایت ذوق وشوق سے دیکھا۔ اُنہی دنوں ٹیلی وژن پر تحریکِ پاکستان کے حوالے سے سوال و جواب کا ایک پروگرام "ذوقِ آگہی" بھی چل رہا تھا۔ ان دونوں پروگراموں نے ایک دوسرے کو مہمیز کیا۔ وہ معلومات جو نسلِ نو کو مختلف کُتب میں غیر مربوط شکل میں ملتی ہیں۔ "تعبیر" کی صورت میں ایک تسلسل اور ڈرامائی دلچسپی کے ساتھ سامنے آئیں تو نسلِ نو نے اس سے بھرپور استفادہ کیا۔ عام لوگوں خصوصاً تحریکِ پاکستان کے زمانے کی نسل نے بھی اس حوالے سے اپنی یادوں کی بازیافت کی۔ "تعبیر" کی شکل میں ایک خواب کی تعبیر میں ڈھلتے ہوئے دیکھنا واقعی ایک یادگار مشاہدہ تھا۔ سلیم احمد کے بقول بھارتی اخبار "امرت بازار پتریکا" نے بھی "تعبیر" کی پیشکش کو سراہا۔

"تعبیر" کی کامیابی کے بعد سلیم احمد کو نسیم حجازی کے مشہور ناول "آخری چٹان" کی ڈرامائی تشکیل کا کام سونپا گیا۔ ایک روایت کے مطابق سلیم احمد سے اس کام کی خواہش اُس وقت صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے کی تھی۔ سلیم احمد نے اس پروجیکٹ پر بڑی محنت کی۔ یہ پی ٹی وی کی پہلی تاریخی سیریل تھی۔ اس موضوع سے نہ صرف سلیم احمد کو گہری دلچسپی تھی بلکہ وہ اس معاملے میں ایک اتھارٹی سمجھے گئے تھے۔ اس سے پہلے وہ "چنگیز خاں" کو ریڈیو پر پیش کر چکے تھے۔ "سلطان خوارزم شاہ" میں بھی انہوں نے اسی موضوع کو برتا ہے۔ جسے سلیم احمد نے "آخری چٹان" کا موضوع بنایا ہے۔

نسیم حجازی پاکستان میں سب سے زیادہ قارئین کا حلقہ رکھتے ہیں لیکن ادب و شعر اور ریڈیو یا ٹیلی وژن پر ایک خاص گروہ کا قبضہ ہونے کی وجہ سے وہ ایک طرح سے "نظر انداز شدہ مصنف" بن کر رہ گئے تھے۔ "آخری چٹان" کی ڈرامائی تشکیل نے جہاں سلیم احمد کے فن اور قامت میں اضافہ کیا وہاں اس سیریل کے پروڈیوسر قاسم جلالی، جملہ فنکاران اور سٹاف کی محنت کا بھی اعتراف کیا گیا۔ ناول نگار نسیم حجازی کی عوامی مقبولیت میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ اس سلسلے میں کہانی نویس کی حیثیت سے سلیم احمد نے بہترین ٹیم سپرٹ کا مظاہرہ کیا۔ جلالی صاحب کا بیان ہے۔

"سلیم احمد ہمیں ایڈوانس قسطیں لکھ کر دے دیا کرتے تھے جس سے ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ اگر ایک سیٹ پر دوبارہ یا سہ بارہ کوئی سین فلمانا ہے تو وہ ہم ایک ہی بار فلمبند کر لیا کرتے تھے۔ اس طرح بہت سا قیمتی وقت اور روپیہ بچ گیا۔ " قاسم جلالی نے مزید کہا۔ "سلیم احمد مجھے کہا کرتے تھے یار جلو! اس ناول پر کام کرنے میں بڑا لطف آ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں اس موضوع پر لکھتا ہی رہوں۔ "۵

سلیم احمد فن ڈرامانویسی کے اسرار و رموز سے مکمل آگہی رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ڈراما پیکار مسلسل، تحیر و تجسس اور پیغام کے بغیر محض لفظوں کا ایک گورکھ دھندہ بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے ڈراموں میں اپنی بات نہیں کرتے بلکہ لوگوں کی بات کرتے ہیں۔ عوام کے دُکھ، عوام کی خوشیاں، قومی المیے، تاریخی اسباق اور فکری لہریں جب ڈرامے کی جُملہ دلچسپیوں کے ساتھ پردہ اسکرین پر پیش ہوتی تھیں تو لوگ پہلے سے بھی زیادہ سلیم احمد کی کرافٹ کے قائل ہو جاتے تھے۔

سلیم احمد سٹیج، ریڈیو، فلم اور ٹیلی وژن کے حوالے سے وسیع معلومات کا ذخیرہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ان موضوعات پر دستیاب ہونے والا مشرق و مغرب کا سارا لٹریچر پڑھ رکھا تھا۔ نہ صرف پڑھ رکھا تھا بلکہ بقول کسے "وہ اس سارے لٹریچر کو گھول کر پی گئے تھے۔ "اس پر اتنا اضافہ اور کیا جا سکتا ہے کہ گھول کر تو شاید بہت سے لوگ پی لیتے ہیں لیکن اپنے تمام مطالعے اور مشاہدے کو تخلیقی شخصیت کا حصہ بنا کر اس سے "تخلیق نو" RE-PRODUCTION کرنا اصل بات ہے اور سلیم احمد نے یہ کام بحسن و کمال کر دکھایا ہے۔

کتابیات و حواشی

سلیم احمد، سوانح اور شخصیت

۱۔ یہاں مشہور صوفی بزرگ حضرت وارث علی کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔

۲۔ طویل نظم "مشرق" صفحہ ۲۳۔ اُردو مرکز لندن/ مکتبہ نیا ادب۔ کراچی۔ ۱۹۸۹ء

۳۔ سوانحی ناول "بھائی صاحب"۔ شمیم احمد مطبوعہ روایت نمبر ۳۔ اُردو بازار۔ لاہور۔ ۱۹۸۶ء

The Imperial Gazzeeter of India. P.419 oxford-1908

۵۔ مذکورہ شجرہ سلیم احمد کے چچازاد سیّد فرید احمد ولد سیّد مسرّت علی مقیم کراچی کے پاس محفوظ ہے۔

۶۔ طویل نظم مشرق صفحہ نمبر ۴۱

۷۔ طویل نظم مشرق صفحہ نمبر ۲۴

۸۔ طویل نظم مشرق صفحہ نمبر ۲۰

۹۔ طویل نظم مشرق صفحہ نمبر ۲۰

The Imperial Gazzeeter of India. P.424 oxford-1908

۱۱۔ سلیم احمد کا میٹرک سرٹیفکیٹ جاری کردہ بورڈ آف ہائی سکولز یوپی۔ ۲۳ جون ۱۹۴۵ء

۱۲۔ نظم مشرق صفحہ ج

۱۳۔ سراج منیر سے ایک ملاقات۔ ۲۶ جنوری ۱۹۸۹ء۔ لاہور

۱۴۔ شمیم احمد سے ایک ملاقات۔ ۱۴ جنوری ۱۹۸۹ء۔ کراچی

۱۵۔ شمیم احمد سے ایک ملاقات۔ ۱۴ جنوری ۱۹۸۹ء۔ کراچی

۱۶۔ سوانحی ناول" بھائی صاحب" صفحہ ۳۴

۱۷۔ سوانحی ناول " بھائی صاحب " صفحہ ۴۳
۱۸۔ پیش لفظ طویل نظم " مشرق " صفحہ د
۱۹۔ سوانحی ناول " بھائی صاحب " صفحہ ۶۰
۲۰۔ سوانحی ناول " بھائی صاحب " صفحہ ۷۲
۲۱۔ شمیم احمد سے ایک ملاقات ۱۲ جون ۱۹۸۸ء۔ انجولی سوسائٹی۔ کراچی
۲۲۔ تذکرہ شعرائے پاکستان سلطانہ مہر صفحہ ۱۸۷۔ ادارہ تحریر۔ کراچی۔ ۱۹۸۰ء
۲۳۔ طویل نظم مشرق صفحہ ۶۳
۲۴۔ انتظار حسین سے ایک ملاقات ۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ لاہور
۲۵۔ سلیم احمد بنام نظیر صدیقی " نامے جو مرے نام آئے " مرتبہ مصطفیٰ راہی۔ راولپنڈی۔ ۱۹۸۴ء
۲۶۔ محمد حسن عسکری بنام غلام عباس۔ مطبوعہ نیا دور ۷۸۔ ۱۹۷۷ء۔ کراچی
۲۷۔ " کچھ یادیں کچھ باتیں " مطبوعہ حریت۔ کراچی۔ ۱۲ اگست ۱۹۷۴ء
۲۸۔ سلیم احمد بنام سہیل عمر۔ ایک غیر مطبوعہ خط۔ ۲۳ فروری ۱۹۸۰ء
۲۹۔ انٹرویو " یہ صورت گر کچھ خوابوں کے " مرتبہ طاہر مسعود صفحہ نمبر ۵۷۔ مکتبہ تخلیق ادب۔ کراچی۔ ۱۹۸۵ء
۳۰۔ " سلیم احمد " از مجتبیٰ حسین مطبوعہ روایت نمبر ۳۔ لاہور
۳۱۔ " سلیم احمد " از مجتبیٰ حسین مطبوعہ روایت نمبر ۱۳۔ لاہور
۳۲۔ سلیم احمد بنام احمد جاوید۔ مطبوعہ روایت نمبر ۳۔ لاہور
۳۳۔ ڈاکٹر آصف فرخی سے ایک ملاقات۔ ۷ اگست ۱۹۹۱ء کراچی
۳۴۔ سلیم احمد کی پانچویں برسی پر صدارتی خطاب۔ یکم ستمبر ۱۹۸۸ء۔ ہوٹل جبیس۔ کراچی
۳۵۔ جہانگیر کوارٹرز کا آرٹیکل۔ مطبوعہ " رسالہ " حیدر آباد۔ ۱۹۸۵ء
۳۶۔ ڈاکٹر جمیل جالبی " نئی تنقید " رائل بک کمپنی۔ کراچی۔ ۱۹۸۵ء
۳۷۔ انتظار حسین سے ایک ملاقات۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ لاہور
۳۸۔ شمیم احمد سے ایک ملاقات۔ ۹ جنوری ۱۹۸۹ء۔ کراچی

۳۹۔ طاہر مسعود "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" مکتبہ تخلیق ادب۔ کراچی۔ ۱۹۸۵ء

۴۰۔ نظیر صدیقی "نامے جو مرے نام آئے"۔ راولپنڈی۔ ۱۹۸۴ء

۴۱۔ انٹرویو۔ قمر مشتاق "رسالہ" حیدرآباد۔ ۱۹۸۵ء

۴۲۔ سلیم احمد بنام ساقی فاروقی "نیا دور" شمارہ ۷۸۔۷۷۔ ۱۹۷۷ء۔ کراچی

۴۳۔ سلیم احمد بنام ساقی فاروقی "نیا دور" شمارہ ۷۸۔۷۷۔ ۱۹۷۷ء۔ کراچی۔ صفحہ نمبر ۴۴

۴۴۔ "T.V. Times" ۱ اکتوبر ۱۹۸۳ء

۴۵۔ بنام نظیر صدیقی "نامے جو مرے نام آئے" صفحہ نمبر ۱۲۱

۴۶۔ بنام نظیر صدیقی "نامے جو مرے نام آئے"

۴۷۔ فتح محمد ملک "میرے سلیم بھائی" مطبوعہ روایت نمبر ۳۔ لاہور۔ ۱۹۸۶ء

۴۸۔ حمایت علی شاعر "شخص و عکس" المصنفین۔ الفلاح سوسائٹی۔ کراچی۔ ۱۹۸۴ء

۴۹۔ قرۃ العین سلیم "عینی کے انشائیے" مکتبہ کامران۔ کراچی۔ ۱۹۸۵ء

۵۰۔ اعجاز رضوی۔ "کلوز اپ" پاکستان بکس لٹریری ساؤنڈز۔ لاہور۔ ۱۹۸۹ء

۵۱۔ شمیم احمد "سوال یہ ہے" نادر ٹریڈرز مستونگ۔ بلوچستان۔ ۱۹۸۹ء

۵۲۔ عطاء الحق قاسمی "معاصر" شمارہ نمبر ۱،۲۔ لاہور

۵۳۔ ڈاکٹر آصف فرخی۔ حرف من و تو۔ کراچی۔ ۱۹۸۹ء

۵۴۔ ڈاکٹر اسلم فرخی "ٹوٹی ہوئی اکائی" مطبوعہ روایت نمبر ۳۔ صفحہ نمبر ۱۴۴

۵۵۔ ڈاکٹر اسلم فرخی "ٹوٹی ہوئی اکائی" مطبوعہ روایت نمبر ۳۔

۵۶۔ سارہ شگفتہ "سلیم احمد کی یاد میں" "قومی زبان" ستمبر ۱۹۸۷ء۔ کراچی

سلیم احمد بحیثیت نقاد

۱۔ کلیم الدین احمد "اُردو تنقید پر ایک نظر" صفحہ نمبر ۱۰۔ اتر پردیش اُردو اکیڈمی۔ لکھنو۔ انڈیا ۱۹۸۲ء

۲۔ کلیم الدین احمد "اُردو تنقید پر ایک نظر" صفحہ نمبر ۱۰۔ اتر پردیش اُردو اکیڈمی۔ لکھنو۔ انڈیا ۱۹۸۲ء

۳۔ ڈاکٹر شارب ردولوی اور جدید اُردو تنقید" صفحہ نمبر ۱۶۴۔ اتر پردیش اُردو اکیڈمی۔ لکھنو ۱۹۹۰ء

۴۔ ڈاکٹر تحسین فراقی "جستجو"۔ یونیورسل بکس۔ لاہور۔ ۱۹۸۷ء
۵۔ ڈاکٹر انیس ناگی "نیا شعری افق"۔ لاہور۔ ۱۹۹۰ء
۶۔ ڈاکٹر سلیم اختر "اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" صفحہ نمبر ۱۹۰۔ سنگ میل پبلشرز۔ لاہور۔ ۱۹۸۹ء
۷۔ "اوراق" جدید نظم صفحہ نمبر ۱۰۴۔ سرگودھا۔ ۱۹۷۷ء
۸۔ ہفت روزہ "تکبیر" ۲۱ مارچ ۱۹۹۱ء۔ کراچی
۹۔ مجتبیٰ حسین نیم رخ مکتبہ عالیہ ۱۹۸۶ء۔ لاہور۔
۱۰۔ انتظار حسین "ملاقاتیں"۔ مکتبہ عالیہ۔ لاہور
۱۱۔ فضیل جعفری "کمان اور زخم" صفحہ ۱۰۸ اجواز پبلشرز۔ مالیگاؤں۔ انڈیا ۱۹۸۶ء
۱۲۔ وارث علوی "حالی مقدمہ اور ہم" صفحہ نمبر ۱۰۹۔ اُردو انٹرز گلڈ۔ الہ آباد۔ انڈیا ۱۹۸۳ء
۱۳۔ ڈاکٹر انیس ناگی "تصورات فیروز سنز۔ لاہور۔ ۱۹۹۰ء
۱۴۔ ڈاکٹر سلیم اختر "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ"۔ لاہور
۱۵۔ "رسالہ" صفحہ نمبر ۴۳۲۔ حیدر آباد۔ سندھ
۱۶۔ بنام نظیر صدیقی "نامے جو مرے نام آئے"
۱۷۔ محمد حسن عسکری "آدمی یا انسان" مکتبہ جدید۔ لاہور۔ ۱۹۵۳ء
۱۸۔ محمد حسن عسکری "آدمی یا انسان" مکتبہ جدید۔ لاہور۔ ۱۹۵۳ء
۱۹۔ محمد حسن عسکری "آدمی یا انسان" مکتبہ جدید۔ لاہور۔ ۱۹۵۳ء
۲۰۔ محمد حسن عسکری "آدمی یا انسان" مکتبہ جدید۔ لاہور۔ ۱۹۵۳ء
۲۱۔ محمد حسن عسکری "آدمی یا انسان" مکتبہ جدید۔ لاہور۔ ۱۹۵۳ء
۲۲۔ محمد علی صدیقی "نشانات" صفحہ نمبر ۲۰۱۔ ادارہ عصر نو۔ کراچی۔ ۱۹۸۱ء
۲۳۔ محمد حسن عسکری "آدمی یا انسان" مکتبہ جدید۔ لاہور۔
۲۴۔ "ادھوری جدیدیت" صفحہ نمبر ۲۰۲
۲۵۔ روایت نمبر ۴
۲۶۔ ڈاکٹر آصف فرخی ترجمہ "سدھارتھ" قوسین۔ لاہور۔ ۱۹۸۳ء

۲۷۔ ڈاکٹر سلیم اختر "تخلیق اور لاشعوری محرکات" سنگ میل پبلشرز۔ لاہور۔ ۱۹۸۳ء
۲۸۔ ادھوری جدیدیت صفحہ نمبر ۲۳
۲۹۔ فتح محمد ملک "تعصبات" سنگ میل پبلشرز۔ لاہور۔ ۱۹۹۱ء
۳۰۔ ادھوری جدیدیت صفحہ نمبر ۲۳
۳۱۔ فتح محمد ملک "تعصبات" سنگ میل پبلشرز۔ لاہور۔ ۱۹۹۱ء
۳۲۔ ۲+۲= ۵۔ صفحہ نمبر ۶۷۔ قلات پبلشرز۔ کوئٹہ۔ ۱۹۷۷ء
۳۳۔ ہفت روزہ "نُصرت"۔ کراچی۔ مارچ ۱۹۶۳ء
۳۴۔ "روبرو" مطبوعہ "رسالہ"۔ حیدرآباد۔ صفحہ ۶۰۸
۳۵۔ "غالب کون؟" صفحہ نمبر ۱۱۷
۳۶۔ "نئی نظم اور پورا آدمی" صفحہ نمبر ۱۴
۳۷۔ "سلیم احمد شخص اور نقاد" روایت نمبر ۳
۳۸۔ گڈبائی ٹو سر سیّد مشمولہ "نئی شاعری نامقبول شاعری"
۳۹۔ انٹرویو" رسالہ "حیدرآباد صفحہ نمبر ۶۲۱
۴۰۔ بنام نظیر صدیقی "نامے جو مرے نام آئے"

سلیم احمد بحیثیت شاعر

۱۔ دیباچہ "اکائی"۔ کراچی۔ ایڈیشن صفحہ ۱۲
۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "نئی تنقید" رائل بک کمپنی۔ کراچی۔ ۱۹۸۵ء
۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "نئی تنقید" صفحہ نمبر ۲۔ رائل بک کمپنی۔ کراچی۔ ۱۹۸۵ء
۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "نئی تنقید" صفحہ نمبر ۲۔ رائل بک کمپنی۔ کراچی۔ ۱۹۸۵ء
۵۔ فتح محمد ملک "تحسین و تردید" صفحہ نمبر ۲۸۷۔ اثبات پبلشر۔ راولپنڈی
۶۔ ڈاکٹر طاہر مسعود "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" صفحہ نمبر ۶۰۔ مکتبہ تخلیق ادب۔ کراچی۔ ۱۹۸۵ء
۷۔ "نئی تنقید اور آدھا آدمی" مطبوعہ فنون دسمبر ۱۹۴۷ء

۸۔ "سلیم احمد کی غزل" مطبوعہ روایت نمبر۴

۹۔ فلیپ "اکائی" ۔ لاہور ایڈیشن

۱۰۔ فلیپ "چراغ نیم شب"

سلیم احمد بحیثیت کالم نویس

۱۔ "رسالہ "جلیسانِ ادب ۔ حیدرآباد ۔ سندھ ۔ صفحہ نمبر ۶۰۲ ۔ ۱۹۸۵ء

۲۔ انٹرویو مطبوعہ "Monthly HERALD" ۔ کراچی ۔ ستمبر ۱۹۸۶ء

۳۔ روزنامہ "حریت" ۲ دسمبر ۱۹۸۲ء

۴۔ سلیم احمد کی کالم نویسی صفحہ نمبر ۳۹ ۔ جامعہ ۔ کراچی ۔ ۱۹۹۰ء

سلیم احمد بحیثیت ڈراما نویس

۱۔ "اُردو دائرہ معارف اسلامیہ" جلد نمبر ۱۵ ۔ صفحہ نمبر ۶۹۷ ۔

۲۔ "تذکرہ شعرائے پاکستان" مرتبہ سلطانہ مہر ۔ صفحہ نمبر ۱۸۶

۳۔ روایت نمبر ۳ صفحہ نمبر ۱۲۹

۴۔ ایک ملاقات ۱۶ جون ۱۹۹۱ء ۔ لاہور

۵۔ "T.V. Times" ۔ کراچی ۔ اپریل ۱۹۸۸ء